HABIBIA ISLAMICUS
(The International Journal of Arabic &Islamic Research) (Quarterly) Trilingual (Arabic, English, Urdu) ISSN:2664-4916 (P) 2664-4924 (E)
Home Page: http://habibiaislamicus.com
Approved by HEC in Y Category
Indexed with: IRI (AIOU), Australian Islamic Library, ARI, ISI, SIS, Euro pub.
PUBLISHER HABIBIA RESEARCH ACADEMY
Project of **JAMIA HABIBIA INTERNATIONAL,** Reg. No: KAR No. 2287 Societies Registration Act XXI of 1860 Govt. of Sindh, Pakistan.
Website: www.habibia.edu.pk,
This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.

TOPIC:

A COMPARATIVE STUDY OF ARABIC AND HEBREW: A HISTORICAL AND RESEARCH-BASED PERSPECTIVE

عربی اور عبرانی زبانوں کا باہمی تقابلہ: تاریخی و تحقیقی تناظر میں

AUTHORS:

1. Dr. Muhammad Ali Junaid, Research Scholar& Author /Visiting Faculty Member University of Karachi. Email: majunaid@live.com

How to Cite: Junaid, Dr. Muhammad Ali. 2025. "A COMPARATIVE STUDY OF ARABIC AND HEBREW: A HISTORICAL AND RESEARCH-BASED PERSPECTIVE: عربی اور عبرانی زبانوں کا باہمی تقابلہ: تاریخی و تحقیقی تناظر میں". *Habibia Islamicus (The International Journal of Arabic and Islamic Research)* 9 (3):01-27.
DOI: https://doi.org/10.47720/hi.2025.0903u01.
URL: https://habibiaislamicus.com/index.php/hirj/article/view/325
Vol. 9, No.3 || July –September 2025 || P. 01-27
Published online: 2025-09-30

QR. Code

A COMPARATIVE STUDY OF ARABIC AND HEBREW: A HISTORICAL AND RESEARCH-BASED PERSPECTIVE

عربی اور عبرانی زبانوں کا باہمی تقابلہ: تاریخی و تحقیقی تناظر میں

Dr. Muhammad Ali Junaid,

ABSTRACT:

This research paper explores two interconnected theses on the role of language in national formation and linguistic antiquity. The first thesis demonstrates, through historical and evolutionary analysis, the essential necessity of a single central national language for fostering state unity and constructing a cohesive nation-state. Drawing on examples from nation-building processes across history, it argues that a unified linguistic framework serves as a foundational element for social integration, cultural homogeneity, and political stability, mitigating fragmentation in multilingual societies and enabling the evolution of a shared national identity. While acknowledging debates on linguistic diversity, the analysis substantiates that nationalism historically prioritizes a dominant language to overcome divisions and promote collective allegiance. The second thesis provides historical and religious evidence establishing the greater antiquity of the Arabic language—both in spoken and written forms—compared to Hebrew. It traces Hebrew's trajectory through centuries of Jewish persecution, diaspora, and assimilation under Christian influences, leading to its effective extinction as a vernacular by late antiquity, where it survived only among a limited scholarly elite. In the early centuries CE, Rabbi Yehuda HaNasi codified the Mishnah around 200 CE, contributing to the preservation of religious texts like the Talmud and Torah, but Hebrew remained dormant until its revival in the 20th century through dedicated efforts by Zionist scholars and the Hebrew University of Jerusalem. In contrast, Arabic maintained uninterrupted continuity throughout history, with speakers spanning Arab and non-Arab communities, an expanding vocabulary, and widespread use across regions. Religious sources, particularly the Quran preserved in written form since the 7th century CE, affirm Arabic's pre-Abrahamic existence, attributing it to ancient Arabian civilizations such as the peoples of 'Ad and Thamud, who received prophets Hud and Salih, and noting its presence in Mecca prior to Ishmael's arrival, where he integrated into local Arabic-speaking tribes like Jurhum. Comparative linguistic evidence highlights Arabic's deeper roots in Proto-Semitic traditions, despite debates on attestation dates, underscoring its enduring vitality over Hebrew's intermittent history. By linking linguistic unity to national cohesion and contrasting Arabic's persistence with Hebrew's revival, this paper contributes to understandings of language as a pillar of cultural and religious identity, with implications for contemporary nation-states and Semitic linguistics.

KEYWORDS: *Semitic linguistics, nation-states, Islam, Comparative linguistic, Ishmael's, 'Ad, Thamud, Arab, orientalists, Orientalism,*

تعارف:

یہ ناچیز عرصہ دراز سے مستشرقین کی فکر و نظر کا مطالعہ کرنے میں مصروف رہا ہے، مستشرقین کا طبقہ مغرب میں مشرقی علوم، تاریخ و مذہب پر ہم دیکھتے ہیں کہ تب تحقیقات کرنے کے لئے نمودار ہوا جب، مغرب نے مشرق تک سمندری راستوں سے رسائی حاصل کرلی تھی، اور بتدریج وتاجروں کے بھروپ سے ترقی کرکے حاکم بن گئے تھے، ان کو اس ضمن میں یہ خواہش محسوس ہوئی کہ مفتوح

اقوام کو سمجھنے کے لئے ان کے مذہب، تاریخ، تمدن، ثقافت پر تحقیقات کی جائیں، دوسرا ان کا مطمع نظر یہ بھی رہا تھا کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ ان کا دور روشن خیالی، اعتدال پسندی، عدل و انصاف کا دور ہے، جبکہ مفتوح اقوام دور تاریکی میں ظالم و جابر فقہ پرست، تنگ نظر مذہبی رجحان کے حامل حکمرانوں کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے تھے۔

انھونے ہندوستان کو فرقہ واریت کا تحفہ دیا جس سے ایک تو عرصہ دراز سے یہاں آباد شیر و شکر ثقافتوں میں اجنبیت پروان چڑھی، مخاصمت کی خواہش پیدا ہوئی فرقہ وارانہ تاریخ لکھنے کی ابتدا ہوئی،، وہیں ایک ہی فکری دایرہ کار میں ذیلی مسالک تک میں اجنبیت در آئی، آج ہندوستان میں جو ہندو و مسلمان کا مسلہ موجود پایا جاتا ہے یہ بھی ان کی دین ہے، اورآج جو مسلمانوں میں اپنی اپنی ذیلی لسانی، قبایلی، نسلی، فقہ وارانہ عصبیتوں کا عروج پایا جاتا ہے، یہ بھی ایک طرح سے ان آقاوں اور ان کے لئے تحقیقات کے نام پر کتابیں لکھنے والے مستشرقین کا تحفہ ہے، انھونے مسلمانوں کے ذہنی فکر و حالت اتنی بدحال کر دی ہے کہ وہ اوردو جس نے پاکستان کی تحریک میں وحدت پیدا کی تھی اس کو ہی ہماری قوم نے اجنبی زبان سمجھ لیا ہے۔

ایک مشہور اوردو کے پنجاب سے تعلق رکھتے مترجم صاحب جن کا اگرچہ اوردو پر عظیم احسان ہے، انھونے کل وقتی طور پر مغربی کتب کے اوردو تراجم کرنے کو اپنا پیشہ بنایا ہوا ہے، اور اوردو کے وجود کو ان تراجم سے ہرا بھرا کر دیا ہے، وہ فیس بک پر یہ تبصرہ کرتے نظر آتے ہیں کہ، کیوں ایک اجنبی زبان کو اس ملک کی قومی زبان بنادیا گیا ہے، کیونکر یہ ریاستی جبر کیا جارہا ہے؟ اب آپ خود علم کی موت جب روشنائی کے اندھیرے تلے نمودار ہوتی دیکھیں گے تو سر پیٹنے کے سوا کیا راستہ بچتا ہے۔

اس ضمن میں عبرانی کے لئے، یہودیوں کی محنت و قربانی عقلمندوں کے لئے اشارہ ہو گی، یعنی ہماری جو مخالفانہ روش اس تحریر میں ملے گی اس کی کوکھ میں بھی ایک قوم کی وحدت کے لئے زبان کو زندہ جاوید کرنے کا کارنامہ سامنے آیگا، جس سے معلوم ہو گا کہ کیسے یہودی دانشور، ماہرین لسانیات و اساتذہ کرام دوسری صدی عیسویں میں عبرانی کے لئے کوشش کر رہے تھے، کیسے وہ سلطنت عثمانیہ کے زوال کے آخری پچاس عشروع میں 1948 میں اسرایل کے باقاعدہ قیام سے قبل اس ریاست کی قومی زبان کے لئے جدوجہد کر رہے تھے، جو ابھی عام آنکھ کی نگاہ میں پیدا ہونے کی خبر میں نہیں تھی، کیسے 1917 کے بلفور ڈاعلامیہ نے اس زبان کی تدوین میں تیزی دکھائی تھی۔

ایک واحد زبان اور متحدہ ریاستی شناخت کا مسلہ:

مزے کی بات یہ ہے کہ اوردو کے حواس خمسہ سمجھے جانے والے، سید احمد خان، شبلی، حالی، ڈپٹی نذیر احمد، اور محمد حسین آزاد بھی برطانوی حکومت کے اقتدار کے عروج میں ہندوستان میں گزرے تھے، اور دھلوی سایئنٹفک علیگڑھی اوردو بھی ہم دیکھتے ہیں کہ 1957 کے ہنگامہ کے بعد سے تشکیل پاکستان 1947 تک دن دگنی رات چگنی ترقی کر رہی تھی اور اس ضمن میں علیگڑھ، ندوہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، جامعہ ملیہ دھلی اور جامعہ عثمانیہ پیش پیش نظر آتی ہیں۔ چناچہ اوردو اس ریاست کی قومی زبان بنی جو مسلمانوں کے لئے ہندوستانی

ریاست کی قدیم کوکھ سے کٹ کر 1947 میں نمودار ہوئی تھی۔ اور عبرانی 1948 کو اسرایل کی زبان بنی جو وہاں کے نسلی تاریخی باشندوں کا استحصال کر کے عالمی جبر و قوت کے بطن سے نمودار ہوئی ہے، یہ اس قوم کی زبان بنی جس قوم کا دارومدار خطے، سے نہیں تھا، رنگت پر نہیں تھا، اس کا دارومدار نسل پر تھا، اس نسل کو جس کی مادری زبان دنیا کی مختلیف بولیاں تھیں، جو یورپ، امریکہ، مشرق وسطی اور سویت یونین سے تعلق رکھتی تھیں، سب نے نسلی وحدت وریاستی صیہونی ریاست کے لئے اپنی اپنی ارتقائی انفرادیتوں اور مادری زبانوں کی قربانی دی اور نومولود جدید عبرانیت کو مشترکہ ورثہ کی زبان سمجھ کر اپنالیا۔

جو لوگ اپنی مادری زبان یا صوبائی عصبیتوں کو اسلام و پاکستان پر مقدم رکھتے ہیں اور جب وہ اپنے افکار کے لئے کارنامہ سرانجام دینے، اس کے لئے خدمات سرانجام دینے کا رویہ ظاہر کرتے ہیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے، وہ جس کو اپنا نہیں مانتے ،ان کی شہرت، مقام و عزت صرف اسی زبان کے سبب ہے۔ جس کو وہ اجنبی گردانتے ہیں، وہ اس کی خدمت نہیں کر رہے ہیں بلکہ یہ اس سے اپنی دال روٹی جنم دے رہے ہیں،، یہ اور دو زبان ہی جس میں اس وقت مسلم دنیا کا سب سے بڑا اسلامی علوم سے متعلقہ ذخیرہ موجود پایا جاتا ہے، جس میں کل ہندوستان کے مسلمان اپنی مختلیف مادری بولیوں و اختلاف کے باوجود کلام کیا کرتے تھے، جبکہ ان کی مادری صوبائی زبانوں میں بیرون صوبہ وذات بات چیت کرنا مشکل امر سمجھا جاتا ہے، وہ یہاں ذرا عبرانی زبان کے ارتقا کو دیکھیں جس کو یہودیوں نے دنیا بھر کے یہودیوں کی ملی زبان بنانے، مردہ سے زندہ بنانے کے لئے جو جدوجہد کی ہے، اس پر اسی تحریر میں روشنی ڈال گئی ہے۔

یہ تحقیق کہنے کی حد تک عربی کے تقابلہ میں پیش ہوئی ہے، مگر اس میں دنیا کی ایک طاقتور ترین اقلیتی قوم کی تشکیل و وحدت کی زبان کا ارتقا بیان کیا گیا ہے، جس سے مسلمانوں کو بہت کچھ دیکھنے اور سیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے، مسلمان اصل میں فکری خلجان، اضطراب کا شکار ہو رہے ہیں، ان کا وجود بیک وقت زمانہ قدیم و عصر حاضر سے وابستگیوں کے درمیان، حقیقت پسندی اور عینینیت پسندی کے درمیان پھنسا پڑا ہے، وہ ماضی و حال میں تناسب پیدا کر کے چلنے کی بجائے، دونوں کو دو بیتی تناظر میں دیکھ پرکھ رہے ہیں، وہ دین و دنیا کو ایک ہی عظیم مستقبل کی مستقل بنیاد سمجھنے کی بجائے ان کو مد مقابل کر کے منتخب کرنے پر پریشان ہیں، وہ مادری زبان اور قومی زبان، قدیم ریاست اور جدید ریاست کی تفریق کرنے کے بجائے عصبیتی خوردی تصور حیات کی وابستگیوں میں پڑ کر ملت کے خواب کو ناممکن جاننے لگے، انھونے اپنے اپنے ذاتی میلانات و رجحانات کو اپنا دین و مذہب بنالیا ہے، سب نے ایک بڑی جامع مسجد میں پیدل چل کر جانے کے بجائے ہر گلی، محلے میں اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد بنا کر رہنے اپنا دین سمجھ لیا ہے۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں پا رہے ہیں کہ عصر حاضر میں وحدت ایک مرکزی، واحڈ زبان سے آتی ہے، ایک سے زاید زبانوں کی آینی تسلیمیت کچھ دل ضرور خوش کر سکتی ہے، مگر جدید مستقل، طویل عرصہ چلنے والی ریاستی قوم کی کی تکمیل و تشکیل نہیں کر سکتی ہے۔ کیونکہ ایک واحد زبان ہی مستقل، واحد و متفقہ قوم کی تشکیل کرتی ہے، اس لئے چاہے ایک لبرل سیکولر ریاست ہو یا کوئی مذہبی ریاست جغرافیائی ٹکڑوں کو مرکز کو وحدت و یکجہتی میں پرونے کے لئے ایک اور واحد زبان کی ضرورت پڑتی ہے۔

انھونے تقسیم کے بعد ایک ہی ملک کے دو حصوں میں آئینی تقسیم کے بعد اپنے وجود کو اصل قدیم سمجھا اور آزاد مسلم ریاست میں آنے والوں کو اجنبی، بیرونی مہاجر گردانا، حلانکہ 1947 سے پہلے جو ہندوستان تھا وہ موجودہ ہندوستان و پاکستان کا وحدتی مجموعہ تھا، جس میں مشرقی بنگال بھی موجود تھا۔ موجودہ آئینی نوعیت کے حامل معاہدہ عمرانی کی کوکھ سے پیدا ہونے والے ہندوستان و پاکستان تاریخی وجود کم آئینی مابعد الطبیعات سے تخلیق شدہ انتظامی وجود زیادہ ہیں، چناچہ متحدہ مذہبی ملت کی تشکیل کا جو خواب معماران قوم نے دیکھا تھا وہ 1971 میں خلیج بنگال میں ڈوب گیا بقیہ موجودہ پاکستان میں اسے بحیرہ عرب میں ڈبونے میں مصروف ہیں۔

اس مقالہ میں عبرانی کے مقابل جو زبان پیش خدمت ہے وہ عبرانی زبان ہے جس سے یہود و نصاری دلی انسیت ظاہر کرتے ہیں، یہ عربی نبی اکرم ﷺ کی زبان ہے، قران کی زبان ہے، حدیث و فقہ کی زبان ہے، تفاسیر کی زبان، کل مشرق وسطی کے رابطے کی زبان ہے، کل مذہبی مدارس کے قرانی جوہر کی زبان ہے، چناچہ آج لوگ باتیں بنا رہے ہیں عربی تہذیب خارجی و بیرونی ہے، ظاہر ہے جن کو اپنے تاریخی سلسلے سے اجنبیت محسوس ہو جو غوری، محمود و ابن قاسم کو بیرونی حملہ آور گردانیں، راجہ داھر و رنجیت سنگھ کو دھرتی کا فرزند جانیں، جن کو ہڑپہ و وادی سندھ کی تہذیب سے زیادہ عقیدت ہو ان کے لئے اسلام، عربی اور دو و فارسی اجنبی وراثت ہی رہیں گی۔

مستشرقین، ثقافتی تنوع اور کثرت پسندی کے شاخسانے:

ذیلی شناختوں اور کلچرل ڈایورسٹی کے عقیدے میں ہی اجتماعیت، ملت و وحدت کی موت ملتی ہے، اور مقامی چھوٹے چھوٹے غیر تاریخی مفتوح موقفوں کی فتح پائی جاتی ہے۔ مگر مغربی اقوام مسلمان فاتحین کے بر خلاف مقامی، اجنبی نا ہو کر بھی یہی ظاہر کرتے رہے ہیں کہ اصل میں، انھونے مشرق پر قبضہ نہیں کیا تھا، بلکہ مشرق خود کمزور تھا، تاریکی میں پڑا تھا، اس میں تجسس، تحقیق و تسخیر کی جستجو و خواہش سرے سے موجود نہیں تھی، اور مغرب ان کو یہ امور سکھانے آیا ہے، وہ جاہل تھے اس نے ان کو عالم بنایا، وہ پسماندہ تھے مغرب نے ان کو ترقی یافتہ بنایا ہے۔ رابرٹ ریلی مسلم قوم کی فکری خودکشی نامی کتاب میں مسلمانوں کو غیر معقولی، حقیقت سے دور متعصب گردانتا ہے، اس کو لگتا ہے کہ غزالی کی فتح نے مسلمانوں کو علمی و فکری طور پر مفلوک الحال کر دیا ہے، وہ باور کراتا ہے کہ اشعری کی معتزلہ پر فتح مسلم شعور کی موت تھی، یہ اصل مسلم شعور کی موت سے زیادہ مغرب کے شعور کی بات ہے، وہ فراموش کر جاتے ہیں کہ جس شعور کو وہ شعور گردانتے ہیں وہ شعور ان کا تخلیق کردہ ہے، جس کے سوا وہ کسی اور شعور ذات سے ناواقف ہیں اور نا تسلیم کرتے ہیں، جس کے لئے سایئنسدانوں ،فلسفیوں سے بھی زیادہ مستشرقین نے کام کیا ہے، انھونے سیرت، تاریخ و حدیث کی خدمت نہیں کی ہے، بلکہ انھونے اس خدمت سے مسلم تشخص و انفرادیت پر ایسا خنجر چلایا ہے، جس نے مسلمانوں کو شناخت کے مسلہ میں صحرا نوردی پر مجبور کر دیا ہے، اس ضمن میں یہ امر فراموش نا کیا جائے کہ یہودی عبرانی تہذیب نے جو نشاۃ ثانیہ کی کوکھ سے چلتی ہوئی انسانی حقوق کے حمل میں جا بیٹھی تھی اسی سے جدید صیہونی فتنہ پیدا ہوا ہے، عیسائی کہنے کو الحاد میں ضم ہو چکے ہیں، مگر یہ الحاد اصل میں خود نشاۃ ثانیہ کے ادب و ہیومن رائٹس کا ایسا بغل بچہ ہے

جس کو کوکھ عیسایت نے ہی فراہم کی ہے، یہ مستشرقین غالب عنصر میں عیسائی فکر و مذہب سے تعلق رکھتے ہیں مگر ظاہر خود کو لبرل و سیکولر کرتے ہیں، چناچہ اسلام کے خلاف، الحاد، عیسایت، یہودیت، صیہونیت اور جدید مملکتیں اتحاد کر چکی ہیں، مغربی استشراقیت اصل میں سینٹ جان آف دمشق کی فکر کی فرع ہے، جس کی بابت ہم اپنی زیر تحقیق کتاب میں روشنی ڈال چکے ہیں، اور انفرادی، لسانیتوں پر اصرار، نسلوں پر اصرار، مسلم ملت کا انکار ہے، اس کے وجود میں رہتے ہوئے اسی کے وجود کو زہر دینے کے برابر ہے۔

سامی مذاہب کا ابراہیمی سلسلہ اور مسلمانوں سے عناد:

چونکہ مشرق وسطی، وسطی ایشیا و ہندوستان تک مسلمان بتدریج، مختلیف اقوام و مذاہب کو شکست دے کر غالب ہوئے تھے، جبھی انھونے باوجود یہ کہ اسلام بھی عیسائی و یہودی مذاہب کی طرح سامی المذاہب دایرہ کار کا دین تھا، چناچہ ان کو جو ذہنی و فکری وابستگی، شرک، کفر یابت پرستی کی مخالفت میں مسلمانوں سے ہونی چاہئے تھی، ان کا رویہ اس کا الٹ رہا، انھونے اس کے بجائے بت پرست اقوام جیسے ہندوستان کے ہندووں، سے اس کے برخلاف فکری معتدلیت کا مظاہرہ ظاہر کرنا شروع کر دیا چونکہ، مسلمانوں نے اپنی فکری و توحیدی جڑیں، ابراہیمؑ سے خاص طو پر ملائی تھیں، اور یہودی و عیسائی مذاہب بھی یہی دعوی کرتے ہیں، لہذا انھونے مسلمانوں کی اس نسلی، فکری وابستگی کو بلاواسطہ ماننے کی بجائے، اپنے وسیلہ سے ظاہر کرنے کی کوشش کی، بلکہ مسلمانوں کی فکر کو فکری سرقہ گردانا، قران نے بھی ابراہیمؑ کے قصے کو بہت تفصیل و سوال جواب کے روپ میں پیش کیا ہے، اسلام کا موقف یہاں ماخذ و تلمذ کا نہیں ارتقائی تسلسل کی وراثت کا رہا ہے لہذا مسلمان جو اسلام کے پیروکار ہیں، آدمؑ سے نبی اکرم ﷺ تک تمام انبیائے کرام کو ایک ہی دین اسلام کا پیروکار، اور ماننے والا سمجھتے ہیں، اور تمام انبیا کی دعوت کو جغرافیائی اختلاف کے باوجود اصول دین کے تناظر میں یکساں جانتے ہیں۔

اس ضمن میں چونکہ نبی اکرم ﷺ خاتم الانبین مسلمانوں کے نزدیک آخری رسول و نبی تصور کئے جاتے ہیں، لہذا، عرب کے مسلمان جنھونے ان کی دعوت پر لبیک کہا، ان کے جد امجد اسمعیلؑ بن ابراہیمؑ کو مانتے ہیں، دراصل ابراہیمؑ کی دونوں اولادوں کی جڑیں نسبی تناظر میں ابراہیمؑ سے جاملتی ہیں انہی سے حجازی اسمعیلی اور عبرانی اسرایلی یہودی مذہب کا آغاز ہوا، بنی اسرایل کی زبان مابعد عبرانی و سریائی قرار پائی اور حجازی مکی اسمعیلیوں، قریشیوں کی زبان عربی قرار پائی، ہم اس تحقیق کے ضمن میں جتنا دریافت کر پائے ہیں کہ عربی زبان اور عربوں کا وجود اسمعیلؑ کی مکہ آمد سے قبل ہی موجود تھا، حد یہ کہ یوسفؑ کے دور کا فرعون بھی ہسکوس تھا، اور عربی النسل تھا، جس نے کچھ عرصہ مصر پر غلبہ پایا تھا، فلسطین پر فلسطینی مطالبہ دراصل مذہبی نہیں نسلی وارضی نوعیت کا حامل ہے فلسطینیوں کی قدامت اسلام کے سبب نہیں بلکہ دھرتی کے قدیم سپوت ہونے کے سبب پائی جاتی ہے، عربی و قرانی عربی کی تاریخ کے ضمن میں مولانا سلیمان ندویؒ کی کتاب تاریخ ارض القران اپنی مثال آپ ہے۔

مستشرقین کے اعتراضات اور اسلام دشمنی کی روش:

مستشرقین کے یہاں جو علمیت و تحقیق کے نام پر کھیل تماشہ کھیلے جاتے ہیں، اس کے پس پشت، عیسائیت و یہودیت کی خدمت کے ساتھ ساتھ، جہاں ایک طرف استعماری آقا حکومتوں و ریاستوں کے لئے ذہین ہموار کرنی تھی، تو دوسری طرف مسلمان جو اب ان کے محکوم ہو چکے تھے، کو فکری و مذہبی طور پر دین سے گمراہ و بیزار کرنا مطلوب تھا، انھونے اس ضمن میں جہاں اعتراضات کی بھرمار کی تو وہیں انھونے نبی اکرم ﷺ کی نبوت و وحی کا انکار بھی کیا، بلکہ اس گروہ نے اسلام کو یہودیت و عیسایت کا بدعتی فرقہ گردانا، بلکہ، قران حکیم کو نبی اکرم ﷺ کی لکھی گئی کتاب ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

انھونے قران کو انسانی کلام گردانا، عربی لسان پر اجنبی الفاظوں کا الزام عاید کیا، انھونے نبی اکرم ﷺ کے اسمعیلؑ سے نسبی تعلق کا انکار کیا، دوسری طرف، قرانی قراتوں پر اعتراض کیا، نبی اکرم ﷺ پر غلاموں، بحیرا راہب اور، نسطوریوں سے اخذ و تلمذ کا الزام عاید کیا گیس، توریت و انجیل سے قصص لینے کا الزام عاید کیا گیا، اس قسم کی باتیں ہم نے بطور الزام مستشرقین پر اپنی نئ آنے والی تحقیق میں بیان کر دی ہیں، اس ضمن میں شبلی سید احمد خان، امیر علی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، مدینہ یونیورسٹی بہت کچھ رد کر چکی ہیں۔ برصغیر میں استشراق کا رد کرنے کا سہرا سید احمد خان کے سر جاتا ہے، اگرچہ وہ مغرب سے بہت مرعوب تھے، مگر اتنا طے ہے کہ برصغیر کے اور دو مغربین کی ابتدا ان ہی سے ہوتی ہے، انہی نے سائنٹفک مفروضہ جاتی تردید و نقد سے ولیم میور کی کتاب کا رد کیا تھا، پھر اسی ذہین پر شبلی، سلیمان ندوی، عبدلباری ندوی، حنیف ندوی، ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہ چلے۔

یہاں مقالہ کی مقید حدود بندی ہمیں اس امر پر تفصیل کی اجازت نہیں دیتی ہے کہ کھل کر تفصیل سے بحث کریں، مگر اس ضمن میں ایک محققانہ کتاب پر ہمارا کام جاری و ساری ہے، یہ مقالہ بھی اسی کتاب کے کچھ صفحات کی فرع ہے۔ ہم نے یہ جب جانچا کہ قران حکیم پر اعترضات کی جڑ کہاں جاملتی ہے؟، تو معلوم ہوا کہ اس کی جڑیں اس امر پر استوار ہیں کہ عربی عبرانی سے اخذ شدہ زبان ہے، اس کے بیشتر الفاظ تک عبرانی زبان سے لئے گئے ہیں، ہمارے سامنے کچھ بیانات یاس قسم کے مستشرقین کی جانب سے آئے ہیں کہ عبرانی کا تحریری چلن ہزار قبل مسیح کا ہے اور عربی کا تحریری آغاز، پہلی صدی عیسویں میں ہوا تھا، یہاں یہ امر فراموش کر دیا جاتا ہے کہ، یہ دعوی بس نرا دعوی ہے تاکہ عربی کی قدامت کو حادث ثابت کر کے اسے عبرانی و سریانی کی فرع بنا سکیں، اور پھر یہ دکھائیں کہ عربی کوئی نئ زبان ہے، اور عبرانی اسحق سے چلی آرہی قدیم لسان ہے۔

عربی و عبرانی دو زبانیں ایک خاندان، ایک ہی سرچشمہ:

حالانکہ اسحق و اسمعیلؑ دونوں ایک ہی باپ کی اولاد تھے، اور ابراہیمؑ خود عربی سرزمین عراق کے شہر ار کے باشندے تھے، بنی اسرایل عمالقہ عربیوں کو مفتوح کر کے فلسطین پر قابض ہوئے تھے، عرصہ دراز تک اردن و فلسطین شام کے علاقے تسلیم کئے جاتے

تھے۔ جبکہ عربی بول چال نبطی طرز لکھاوٹ میں ملتی تھی، جس کے کتبہ جات پانچویں صدی قبل مسیح کے بعد کے دریافت ہوئے ہیں، یمن کی تہذیب حجاز کے برخلاف شروع روز سے عربی اقوام کا گڑھ تھی، عہد نامہ قدیم، توریت، و تالمود سے معلوم پڑتا ہے کہ سلیمانؑ اور ملکہ شیبا یا بلقیس جو یمن کی حاکمہ تھی کے درمیان مکالمہ، سفارت و ملاقات ہوئی تھی، قران بھی اس کا ذکر کرتا ملتا ہے۔

جہاں تک زبانی و لسانی مشابہتوں کا تعلق ہے تو یہ زبانیں ایک ہی تاریخی ماخذ و لسانی گروہ سے نکلی ہیں، اور منطقی بات ہے کہ ثانوی ماخذات، بنیادی ماخذات کی فرع ہوتے ہیں، اور فروع اصول سے موخر ہوتے ہیں، چناچہ عربی و اور دو معمولی تفریق کے ساتھ ہم زمانہ ہیں، دونوں کی اصل ایک ہے، جبھی ان میں ایک ہی ول کی فرع ملتے جلتے الفاظ پائے جاتے ہیں، اگرچہ جغرافیہ اور نسلی شاخوں نے ان میں اختلاف و تفریق پیدا کر دی ہے، مگر ان کی مشابہتیں یکساں اساس کے سبب ہے اور ایک ہی مشرق وسطی کے خطہ میں رہایش کے سبب ہے، چناچہ سریانی، عربی، و عبرانی تینوں سامی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، توریت و یہودی تاریخ جس سے عیسائی اپنی جڑیں ملاتے پھرتے ہیں اس بات کا اقرار کرتی ہیں کہ توریت کئی دفعہ دنیا سے غایب ہوئی، یاداشتوں سے بار بار لکھی گئیں، لہذا عبرانی متروک زبان بنی رہی یہاں تک 1948 میں موجودہ اسرایل کی حکومتوں، ہیبریو یونیورسٹی نے اس کی بحالی کی مہم چلائی، ورنا اصل توریت، اس کی زبان، انجیل کی زبان قدیم نسخوں کی کوئی عبرانی محقق جڑ ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی ہے، جبکہ عربی زبان ہمیشہ سے عرب صحروں سے سرزمین ہلال تک محفوظ رہی، کبھی معدوم نہیں ہوئی، اس کی زبان میں مسلسل ارتقا میل و ملاپ سے وسعت آتی رہی، اور اتنی وسعت آئی کہ غیر عربی اقوام نے بھی اس زبان میں لکھا اور پڑھا ہے اسی بحث کو ہم نے اپنی تحقیق میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں عربی کی قدامت، محفوظیت اور عبرانی کی تاریخی ضبوحالی اور از سر نو اختراع سازی اور رایج کرنے پر روشنی ڈالی ہے۔

لاطینی آرامی، عربی و عبرانی کا تاریخی تعلق؟

یہ امر یاد رکھا جائے کہ اگرچہ یسوع مسیح کے دور میں رومن سلطنت شام و فلسطین پر قابض تھی، اس کی دفتری زبان قدیم لاطینی تھی، مگر شام و فلسطین کے لوگوں میں آرامی زبان بولی جاتی تھی، یہ بذات خود زبانوں کے سامی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ موجودہ عبرانی اندازاً تین ہزار سال پرانی بیان کی جاتی ہے، مگر اس موجودہ زبان کی تدوین و ترویج بہت بعد کی بات ہے اور اس کا باقاعدہ سرکاری استعمال، نصاب کے ذریعہ ترویج اسرایل کی تشکیل کے بعد شروع ہوا، اس متروک مردہ زبان کو ہبریو یونیورسٹی کے ماہرین کی کوششوں سے زندہ کیا گیا ہے۔

جبکہ عربی زبان ایک قدیم زبان ہے، اس کی لکھائی کوئی قران سے شروع نہیں ہوئی تھی بلکہ اس سے قبل بھی موجود تھی جب قران لکھا نہیں گیا تھا، قران اسی زبان میں اترا تھا جس میں قدیم عربی قبایل باہمی اشتراک و مکالمہ کیا کرتے تھے، جس میں ان کے شعرا اپنا کلام پیش کیا کرتے تھے، جس کو وہ زبانی اپنے وسیع و گہرے حافظے سے سامعین تک منتقل کیا کرتے تھے، جس میں ان کے قدیم معاہدے

تک لکھے گئے تھے، قریشی قبایل میں عربی لکھت پڑھت کا ثبوت تو قران سے قبل بھی ملتا ہے، قران میں جو الفاظ، معنی و مفہوم بیان کئے گئے ہیں ان سے مقامی عربی اذہان بخوبی واقف تھے۔ خود قدیم عربی شاعری کے نمونوں سے شعب ابی طالب کے معاہدے، اس سے قبل حلف فضول وغیرہ سے بھی عربی تحریر جو بنانقطہ کے لکھی جاتی تھی کے وجود کا ثبوت معلوم پڑتا ہے۔

یہ تو اوپر سطور میں بیان کر دیا گیا ہے کہ عبرانیوں اور عربیوں کے جد امجد میں سے ایک ابراہیمؑ تھے جن کی سرزمین اریعنی عراق کا علاقہ تھی۔ بتدریج عربی و عبرانی دو الگ الگ قوموں کے اختلاف و استعمال سے ارتقا کے ساتھ الگ ہوتی گئیں۔ مگر دونوں کا تعلق ایک ہی خاندان سے ہے، عربی زبان کے لئے کسی واحد قریشی، مدنی قوم کی تخصیص نہیں ملتی ہے، یہ زمانہ قدیم سے یمن، وغیرہ کی بھی زبان تھی، یہ عرب عاربہ و بایدہ کی زبان تصور کی جاتی ہے۔ اسی طرح یسوع مسیح پر کس زبان میں انجیل اتری، قدیم صحایف کی کون سی زبان تھی، توریت کی اصل زبان کون سے تھی یہ امور تحقیق طلب ہیں۔ کچھ کا دعوی ہے کہ یہ کئی زبانوں میں اتری تھی مگر غالب رائے یہ ہے یہ عام یہودیوں کی زبان آرامی تھی جو عبرانی سے ملتی جلتی ہونے کے باوجود الگ زبان تھی۔ موسیٰؑ کے دور میں مصر کی زبان کون سی تھی، قبطی یا کوئی اور ؟توریت کیا مصر کی قدیم زبان میں اتری تھی اور مابعد بنی اسرایل کی غلامی میں انبیا کرام نے یاداشتوں سے جس زبان میں اسے یاداشت سے لکھا اس بابت بھی کوئی شافی شہادت موجود نہیں ہے، کچھ نے تو آشوری وژند ہونے کا بھی گمان کیا ہے۔

عربی و عبرانی دونوں ایک دوسرے مماثل زبانیں ہیں، کچھ کا ماننا ہے کہ دونوں کے پچاس فیصد الفاظ ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں، کچھ کا ماننا ہے کہ عربی زبان اگرچہ عبرانی سے قدیم ہے، مگر تحریری طور پر اس کی روایت عبرانی سے موخر ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ، یہود، و عرب کے جد امجد ابراہیم (ابراہام) عراق کے شہر ار[1] سے تعلق رکھتے تھے جو ایک سمیری تہذیب سے تعلق رکھتا تھا، ان کی زبان کون سی تھی۔ ایک رائے یہ ہے کہ ان کی زبان اکادی تھی[2]، کچھ نے اسے آرامی کہا ہے مگر یہ عیسائی مورخوں اور ان کے ہمنوا لوگوں کا قول ہے۔ کیونکہ آرامی خود عبرانی و عربی سے موخر ہے۔ یہ بھی قیاس ممکن ہے کہ انھونے جب کنعان کی طرف ہجرت کی تو ان کی زبان کنعانی ہو گئی ہو؟

پھر سوال یہ ہے کہ ان کے بیٹے اسحاق اور اسمعیل کی زبان کون سی تھی؟ واضح رہے کہ اسمعیلؑ[3] جزیرۃ العرب میں مہاجر تھے، کچھ انہیں عرب قوم کا بانی مانتے ہیں، [4]توریت و قران سے یہ امور ثابت ہیں، اور ان کی آمد سے قبل جزیرۃ العرب، یمن، وغیرہ میں عربی نما زبان کے نمونے ملتے تھے خود جب اسمعیلؑ کے سبب جس جگہ چشمہ پھوٹ پڑا تو وہیں ایک خانہ بدوش عربی قبیلہ جرھم نے حاجرہؑ سے اجازت لے کر رہایش اختیار کی تھی، اس سے قبل بکہ یا مکہ کے گرد کوئی آبادی موجود نہیں تھی[5] اور کئی قصص سے جن کی اسناد اگرچہ محل نظر ہیں معلوم پڑتا ہے کہ اسی جرھم قبیلہ میں اسمعیلؑ کا نکاح ہوا تھا[6]۔ یوسفؑ کے ساتھ جب بنی اسرایل مصر گئے تو فراعنہ کی زبان تو ہیروگلافی علامتی نوعیت کی حامل تھی۔ مگر مابعد یونانی، و رومی غلبہ کے بعد،، عیسایت و نوفلاطونیت کے بعد مصر میں قبطی قوم اور ان کی زبان

کے چرچے ہونے لگے۔ایک قیاس یہ ممکن ہے کہ موسیٰؑ چونکہ فراعنہ کے یہاں پلے بڑھے تھے تو ان کی زبان عبرانی وہیروگلافی دونوں ممکن ہیں۔

ایک طرف کہا جاتا ہے کہ عبرانی زبان دسویں قبل مسیح میں شروع ہوئی جب داودؑ کا موجودہ فلسطین پر قبضہ ہوا[7]، مگر موسیٰؑ کا دور تو قیاساً پندرہ سو قبل مسیح سے بارہ سو قبل مسیح کے درمیاں کہیں صحیح بیٹھتا ہے، یہ بھی بس مختلیف اقوال کو سامنے رکھ کر کیا گیا ظن و تخمین ہے۔عبرانی کا ابتدائی لکھائی کا دور داود و سلیمانؑ کا دور معلوم پڑتا ہے؟ پھر سوال ہے کہ کیا زبور کی نظموں کی زبان سے عبرانی رسم الخط کا آغاز ہوا تھا؟ اس بابت اصل کلام مابعد اپنے مقام پر پیش ہو گا۔

مگر یاد رکھیں کہ قران جن اہل عرب کے یہاں جانے مانے نبیوں کا ذکر کرتا ہے، جن اقوام عاد و ثمود[8] کا ذکر کرتا ہے، شعیبؑ[9] کا ذکر کرتا ہے قیاساً یہ سرزمین عرب کے انبیا تھے اور یہ اقوام اغلباً نوحؑ کے بعد اور ابراہیمؑ سے قبل گزری ہیں۔ان کے انبیاؑ ان کو کس زبان میں تبلیغ کیا کرتے تھے؟ عربی زبان سامی زبانوں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے جو افرو۔ایشیائی زبانوں کی ایک شاخ ہے۔تاریخی اور لسانی شواہد کے مطابق عربی زبان کی تاریخ تین ہزار سال سے بھی زیادہ پر محیط ہے۔اور ہمارا کہنا ہے کہ یہ چار ہزار سال پرانی ہے۔

عربی کتبات کا احوال:

عربی و عبرانی کا سلسلہ انیس بیس کے فرق کے ساتھ یکساں عہد سے شروع ہوتا ہے، عربی مسلسل زبان کے طور پر اور تحریر کے طور پر زندہ رہی، جبکہ عبرانی پر برے وقت زماں و مکاں کے ساتھ آتے رہے، یہودی قوم دربدر پھرتی رہی، دو دفعہ ہیکل تباہ کیا گیا، بنو کد نضر انہیں غلام بنا کر بابل لے گیا[10] پھر سایرس اعظم نے انہیں آزادی دلائی، واپس کنعان و فلسطین جانے کی اجازت دی ہیکل تعمیر کرنے کی اجازت دی[11]، دو تین دفعہ توریت تباہی کے سبب غایب ہوئی اور پھر نبی اسرایل کے انبیاو کاہنوں کی یاداشتوں سے دوبارہ ضبط تحریر میں لائی گئی[12]، جزیرہ العرب کے یہودی جو مدینہ میں بستے تھے، جن کو کچھ لوگ بنی اسرایل کے گمشدہ قبایل میں سے مانتے ہیں کی زبان روایتوں سے معلوم پڑتا ہے کہ، سریانی تھی، جسے زید بن ثابت رضہ اللہ نے نبی اکرم ﷺ کی ہدایت پر سیکھا تھا۔جبکہ عربی زبان آرامی و نبطی زبانوں کے روپ سے لے کر ذاتی روپ تک زندہ رہی، اس ضمن میں سید سلیمان ندوی کی تاریخ ارض قران عمدہ تحقیقی کتاب ہے۔اس میں یمن کے کئی کتبوں کا تحقیقی ذکر ملتا ہے۔

آگے یہ بیان آیگا کہ خود عبرانی بھی تحریر کی صورت میں صحیح طرح یسوع مسیح کے مصلوب ہونے سو ڈیڑھ سو سال بعد ایک یہودی ربی کی کوششوں سے معرض وجود میں آئی جبکہ اس کے برخلاف نبطی نمونہ کی عربی کے عین عبدات کے کتبہ کی عمر دو سے ڈیڑھ سو قبل مسیح قیاس کی گئی ہے۔اسی طرح قربیٰ بنت عمرو کا کتبہ قیاساً سو قبل مسیح کے قریب کا اندازہ کیا گیا ہے۔یہ شمالی عرب میں دریافت کیا گیا ہے۔اس کے مابعد نقش نمارہ(328 عیسوی) یہ بھی نبطی عربی زبان کا نمونہ گردانا جاتا ہے۔پر شعرا کے کلام بھی معروف ہیں سبع معلقات، جو عرب

کے سات بڑے شعرا کا کلام ہے، زمانہ نبوت سے قبل موجود تھے۔ عرب میلوں ٹھیلوں میں شعرا کلام پڑھا کرتے تھے اور اعلی تسلیم کردہ کلام کعبہ کی دیواروں میں آویزاں کیا جاتا تھا۔ کفار و مسلمان شعرا کا کلام جنگ و امن میں پڑھا کرتے تھے۔ جب سے تاحال عربی زبان محفوظ اور مسلسل موجود ہے، اس سے معلوم پڑتا ہے کہ عربی و عبرانی کا تحریری لسانی سفر معروف لفظوں میں اریب قریب ہوا تھا۔

عربی کی تاریخی ساخت، کمیت و کیفیت:

قران و حدیث کے جو معنی مفہوم چودہ صدیوں قبل موجود تھے، امت کے بڑے طبقے اور اہل علم کا آج تک انہی پر اعتماد و اتفاق پایا جاتا ہے۔ قدیم مخطوطوں کی حفاظت کے سبب، کاتبوں کی نسخہ جات تحریر کرنے کی اسناد کے سبب، عربی زبان عربی قوم کی قلیل التعدادی کے باوجود غیر عربی دنیا میں بھی لکھی، پڑھی، اور بولی جاتی ہے، جس کے سبب اس کے ذخیرہ الفاظ میں نئی نویلے معرب زدہ الفاظوں کا ذخیرہ مسلسل بڑھتا جارہا ہے، دنیا بھر میں شاید ہی کوئی الوحی کتاب ہوگی جس کی اتنی زیادہ تفاسیر مختلیف مناہج پر لکھی گئی ہیں، جتنی قران حکیم کی لکھی گئی ہیں، شاید ہی کوئی زبان ہوگی جس کو ایک ہی زبان میں پڑھنے والے اربوں کی تعداد میں موجود ہوں گے اور جن کی مادری زبان سرے سے عربی نہیں ہوگی؟

جبکہ عبرابی زبان، یہودیوں کے دربدر پھرنے، یورپ میں منتشر ہونے کے سبب خود ان کے ربیوں کے بڑے طبقے کے نزدیک متروک ہوگئی تھی، اسے دوبارہ اسرایلی حکومت کی کوششوں سے زندہ کیا گیا اور اس کا قدیم عبرانی لغت سے کتنا حقیقی تعلق ہے، یہ امر خود تحقیق کا محتاج ہے۔ عربی نے قدیم سامی زبان کی بیشتر صوتیاتی خصوصیات محفوظ رکھی ہیں، جبکہ عبرانی میں وقت کے ساتھ کئی تبدیلیاں وقع پذیر ہوئیں اور خود اس زبان کے عالموں نے اس میں بہت کچھ بدلا۔ عربی کا صرفی نظام قدیم سامی زبانوں کے قریب تر ہے، خاص طور پر اسم کے ثلاثی مجرد مادے، فعل کے ابواب، جنس، عدد اور حالت کا نظام وغیرہ۔ عربی کے بنیادی الفاظ کا بڑا حصہ قدیم سامی لغت سے براہ راست ماخوذ ہے، جبکہ عبرانی نے مختلف ادوار میں دیگر زبانوں کے الفاظ اختیار کیے، موجودہ عبرانی میں اچھے خاصے یورپی زبانوں کے خاندانوں کے الفاظ اپنائے گئے ہیں۔ قدیم عربی رسم الخط مسند، نبطی، ثمودی نوعیت کے حامل تھے، جبکہ عربی رسم الخط کچھ محققین کے نزدیک نبطی رسم الخط سے ماخوذ ہے۔ جبکہ اس کے برخلاف عبرانی قدیم فونیقی رسم الخط سے متاثر تھی اور موجودہ رسم الخط اور قدیم رسم الخط کو محققین نے ایک دوسرے سے مختلیف گردانا ہے۔

عالمانہ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ عربی زبان نہ صرف قدیم ہے بلکہ اس نے اپنی ساخت، صوتیات اور قواعدی نظام کو تاریخی تسلسل کے ساتھ برقرار رکھا ہے۔ عبرانی زبان اگرچہ قدیم ہے، لیکن اس کا تسلسل منقطع ہوا اور اسے جدید دور میں دوبارہ زندہ کیا گیا، جبکہ عربی چودہ سو سال سے مسلسل زندہ و پائندہ زبان ہے جو اپنی قدیم خصوصیات کو محفوظ رکھتے ہوئے مسلسل خط مستقیم پر ترقی کرتی چلی آرہی ہے۔ عربی زبان نا صرف جزیرہ نمائے عرب میں بیرونی زبانوں کے اثرات سے محفوظ رہی ابلکہ دیکھا جائے تو اس نے اپنی لسانی جڑوں کو

زیادہ بہتر طریقے سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

مستشرقین کے دعوے اور انکشافاتی مورخین یا آرکیولجسٹوں کے دعووں کی تفریق:

کلاسیکی عربی کی فصاحت وبلاغت اور قواعد وصرف ونحو کی وضاحت نے اسے ایک مستحکم شکل دی، جسے جدید دور میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ عبرانی زبان نے اپنے طویل سفر میں کئی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ یہ صدیوں تک صرف مذہبی تحریروں اور عبادات میں استعمال ہوتی رہی، لیکن انیسویں صدی کے آخر میں اسے دوبارہ زندہ کیا گیا اور جدید اسرائیل کی سرکاری زبان بنادیا گیا۔ اس عمل میں زبان نے اپنی قدیم شکل سے ہٹ کر جدید تقاضوں کے مطابق ارتقاء کیا۔ عربی زبان میں گرامر اور الفاظ کا وسیع ذخیرہ موجود ہے، اور اس کا صرفی نظام بے حد گہرا ہے۔ اس کے وسیع قواعد اور اشتقاقی خصوصیات اسے ایک منفرد مقام دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر، اگرچہ عبرانی زبان کے قدیم تحریری ثبوت دعووں کی حد تک دل خوش کرنے کے لئے زیادہ پرانے ہیں مگر یہ ثبوت کے درجے تک آ نہیں پائے ہیں، مستشرقین اس قسم کے دعوے مسلمانوں کو ورغلانے کے لئے استعمال کرسکتے ہیں، مگر آرکیولوجی، اور خارجی نقد کی تاریخ نویسی اس کی انکشافی حیثیت تسلیم کرنے سے قاصر ہیں، یہاں مستشرقین کی دنیا سے باہر لبرل آرکیولوجی کا میدان شروع ہوتا ہے۔ تاریخ خود اس قسم کے دعووں کی نفی کرتی ہے، ایسا کوئی محققانہ خارجی نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہے جو نقد وجرح سے نکل کر محققہ ومتفقہ طور پر تسلیم کیا گیا ہو، لیکن عربی نے اپنی لسانی جڑوں کو زیادہ بہتر طریقے سے محفوظ رکھا ہے۔ دونوں زبانوں کا ایک ہی سامی جدّی زبان سے نکلنا اس بات کی دلیل ہے کہ کوئی بھی مطلق طور پر دوسری سے قدیم نہیں۔ البتہ، ان کی تاریخ، ارتقاء اور لسانی خصوصیات انہیں الگ الگ انداز میں قدامت کا حامل بناتی ہیں۔

عربی زبان کی قدامت کو بنیاد بنا کر ابو جلال ندوی نے وادی سندھ کا رسم الخط پڑھنے کا دعوی کیا تھا، اس بابت جامعہ کراچی کے جریدہ میں ان کی تحقیق دیکھی جائے، مذید یہ تحقیق جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم ودانش نے برقی کتاب کی صورت میں آن لاین طبع کرکے پیش کردی ہے۔

> مشہور زبان دان خالد احمد نے بتایا ہے کہ فیصل آباد کے محمد احمد صاحب نے یہ ثابت کردیا ہے کہ تمام زبانیں عربی زبان سے نکلی ہیں۔[13]

قدیم اناجیل ویونانی زبان:

توریت وانجیل کی موجودہ کتب بہت بعد کی آج سے پانچ سو سال پرانی بات ہے اور موجودہ توریت تو سوڈیڑھ سو سال پرانی بات ہے۔ خیر ہماری بات کو رد کرنے والے کثرت سے موجود ہیں مگر اتنا طے ہے کہ اس بابت کوئی متفقہ شک سے خارج حقیقت موجود نہیں ہے۔ خود اغلب رائے تو یہ ہے کہ یسوع کی غیوبت کے بعد کے دور میں لکھنے والوں نے اطالوی اور یونانی معاشرت سے متاثر ہو کر یسوع مسیح کی تصویر کشی انہی کے ادبی نمونہ کو مد نظر رکھ کر کی تھی، اس دور کے فلسطین کے حاکموں اور نوکر شاہی کی زبان میں کی تھی،[14] پیٹر وپال کے تذکروں اور منسوب خطوط سے ایسا ہی تاثر ملتا ہے، اس ضمن میں مختلیف ویب سیریز سے بھی ایسا تخیلی پس منظر اختراع کرنے میں آسانی

میسر آتی ہے خود رومن اطالویوں کی حکومت پر یونانی زبان کے اثرات ان پر غلبہ کے باوجود موجود تھے [15]، بلکہ آج کی مابعد نشاۃ ثانیہ کے بعد کی جدید دنیا، بلکہ کل سماجی علوم پر ان کے اثرات ملتے ہیں، چناچہ گمان غالب ہے ربی یہوداہ نی ساکی کوششوں سے قبل انجیل اور نامکمل عہد نامہ قدیم یونانی زبان میں ملتے تھے،، اور اسی سے مابعد دیگر زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے تھے، پھر جب ربی یہوداہ نی سانے یاداشتوں سے توریت، تالمود و مشنا کو تحریر ہیت دی تو دنیا میں عبرانی مذہبی ذخیرہ کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ زبان بھی یونانی استعمال کی تھی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسیح، اس کی ماں اور حواری کس زبان میں گفت و شنید کیا کرتے تھے؟

اکثر پوچھا جاتا ہے کہ آیا سینٹ پال کی فکر کی حامل تبلیغی حیاتی بایبلی نسخہ جات کی تحریر کے لئے یونانی زبان ہی ہی کیوں چنی گئی تھی، جبکہ یسوع مسیح کی خود کی زبان تو آرامی تھی جو خود عربی کی مشابہ معلوم پڑتی تھی اور اسی خاندان سے تعلق رکھتی تھی، یسوع مسیح بھی بلاخر بنی اسرایل کی ہی فرع تھے اور خود اپنے دعوے و تبلیغی روایات کے مطابق ان ہی کی تعلیم و تربیت کے لئے آئے تھے، مگر ہودی مذہبی طبقے کو یسوع مسیح ہضم نہیں ہوئے، یوں وہ عیسائی عقیدے کی رو سے جان سے محروم کر دئے گئے، سوال پھر وہی ہے کہ آیا پھر ان کے ارد گرد یونانی و آرامی علمیت کیوں گھوم رہی تھی۔ ابھی حال میں اسرایلی دجال، کذاب، نسل کش نیتن یاہو اور پاپ فرانسز شانز میں بحث نکلی کہ اگر یسوع گلیلی و بیت المقدس والے تھے تو ان کی زبان کون سے تھی؟ پاپ کا دعوی تھا کہ ان کی زبان ارامی تھی جبکہ یاہو کہتا تھا(2014) کہ ان کی زبان لازمی عبرانی ہو گی۔ [16]

اب سوچیں جن کی زبان و تحریر از سر نو ان ہی کی ریاست نے دوبارہ زندہ کر کے مدون کرائی گئی ہو، وہ اپنی تعمیر کردہ مابعد الطبیعات سے حقیقت کا رخ بدلنے چلا ہے۔ یاہو اور اس کی ریاست جو کام خون و گولی کی مار سے کرتی ہے، ویسی ہی الزامیت ذاتی مابعد الطبیعات پر استوار استشراقیت اپنے خود ساختہ مفروضہ جات اور قیاس آرایوں سے قایم کرتی نظر آتی ہے۔

عبرانی کا تاریخی وجود تاریخ واستشراق کی روشنی میں:

غور و تدبر سے دیکھیں تو ہمیں عبرانی کا تعلق ایک حد تک تاریخی طور پر اردن کے قدیم شہر ہیبرون [17] سے معلوم پڑتا ہے، قدیم دور میں موجودہ فلسطین، اسرایل، اردن کے علاقے کنعان و شام کا حصہ ہوا کرتے تھے، صدیاں گزرنے کے ساتھ ساتھ ان علاقوں میں کمی زیادتی ہوتی گئی، جہاں تک عبرانی کا تعلق ہے یہ زبان کبھی یہودی علما کی زبان ہوا کرتی تھی، جبکہ عامتہ الناس کی زبان آرامی زبان مانی جاتی تھی، یہی عیسیٰؑ کی بھی زبان بتائی جاتی ہے۔، جس طرح سنسکرت کو برہمنوں کی طبقاتی علمیاتی محدودیت نے کمزور و عنقا کر دیا تھا اسی طرح یہودی ربیوں نے عبرانی کو فری مسینز کی سریت و خفیت کی طرح ربیوں، احباریوں اور صدوقیوں کے طبقات میں محدود کر کے عام یہودی کی دنیا سے خارج کر دیا تھا، یہ اخفا مابعد عبرانی کی معدومیت کی ایک اہم وجہ بنتا گیا۔

یہود و نصاری کے غیر سیکولر مبلغ مستشرقین کا دعوی رہا ہے کہ عبرانی عربی سے قدیم زبان ہے، مگر ان کے پاس اس ضمن میں کوئی

مضبوط شہادت موجود نہیں ہے، عبرانی زبان بھی سامی النسل زبان ہے اور آرامی زبان سے تعلقات رکھتی ہے، عربی، ارامی و عبرانی کی اصل ایک ہی ہے، مذاہبی و فرقہ ورانہ اختلاف کے سبب یہ الگ الگ اقوام سے مختص ہوتی چلی گئیں، جبھی تینوں سامی مذاہب میں مشترکہ الفاظوں کا ایک سانجھے داری ذخیرہ ملتا ہے، اسی ذخیرہ کو مستشرقین نے چالاکی سے کام لے کر قرانی عربی پر سرقہ و اخذ کا الزام قایم کر دیا، اس قسم کے کھیل تماشے لسانیات میں ہر جگہ ملتے ہیں۔ اور ان دعووں کے پس پشت تحقیق کی جگہ ذاتی عقاید، نظریات، میلانات و رجحانات کارفرما ہوتے ہیں، اکثر سیکولر تحقیقوں کے اندر بھی ڈھکا چھپا ازلی تعصب کارفرما ہوتا ہے۔

ہیچی سنز انسیاکلوپیڈیا کے مطابق:

"پہلی صدی عیسویں تک یہ یہودی مدارس میں پڑھائی جاتی تھی، اور عام افراد آرامی بولا کرتے تھے، پھر ارتقا کے ساتھ ساتھ ساتویں اور آٹھویں عیسویں میں جاکر اس کے صرف، نحو اور گرامر میں تبدیلیاں رونما ہوئیں، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جاکر کلاسکی قدیم عبرانی کو مد نظر رکھ کر اس کا احیا کیا گیا جب صیہونیت کا آغاز ہوا تو فلسطین کے یہود نے اسے قومی زبان کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔[18]"

ہیچی سنز انسایکلوپیڈیا کا مذکورہ بالا حوالہ مستشرقین کی آرا کی نفی کرتا نظر آتا ہے، لحاظہ اسے دسویں صدی قبل مسیح کی تحریری زبان گردانا یا عربی سے قدیم گردانا محل نظر ہے، یاد رہے کہ اسمعیلؑ کی والدہ جب ان کو مکہ میں پالنے لگیں تو وہاں جرہم قبیلہ پانی کے گرد آباد ہو گیا تھا، اور انہی میں ان کی شادی ہوئی تھی، تو مسلسل ان کی نسل حجاز و مکہ کی اغلباً زبان عربی میں ہی کلام کیا کرتے تھے، ان کی اولادیں جو جو حجاز سے باہر نکلتی گئیں، ان کی زبان عربی کی قدیم ساخت پر استوار تھی، بلکہ عاد ثمود کی زبان بھی قدیم عربوں کے نزدیک عربی ہی تھی، اس کے علاوہ یوسفؑ کا فرعون بھی ہسکوس نسل کا عربی حکمران تھا، جرھم اور اہل یمن بھی قدیم عربی سمجھے جاتے ہیں، جبھی عبرانی و عربی کا سفر یکساں نوعیت کا حامل نظر نہیں آتا ہے۔

عبرانی مسلسل ابرہیمؑ کے دور سے ہی در بدر بھٹک کر زبان کی خالصیت و اصلیت بھول چکے تھے، جبکہ اہل عرب کے یہاں یہ زبان خالصتاً ہمیشہ سے بنا متروک ہوئے ابتدا سے موجودہ عصر تک مسلسل بولی جا رہی ہے۔ اور ہمیشہ عرب خطوں میں موجود رہی ہے، مسلسل اس میں علمی ذخیرہ موجود پایا جاتا رہا ہے۔ عبرانی کو کبھی یہودیوں یا کچھ عیسایوں کے سوا کسی نے عام بول چال سے تحریر تک استعمال نہیں کیا تھا، جبکہ عربی زبان ہمیشہ عامتہ الناس و خاص دونوں کے یہاں زندہ رہی ہے، اور غیر عربی مسلمانوں میں بولی، سمجھی اور لکھی جاتی رہی ہے، خود قران کو لے لیں دنیا میں سب سے زیادہ اس کی تفاسیر اور دو زبان میں پائی جاتی ہیں۔ حلانکہ اس کے متن کی اصلی زبان عربی ہی ہے، پاکستان کا اور دودان ہو یا مصر و شام سے افریقہ تک کا مسلمان سب قران کو اس کی ذاتی قدیم عربی میں ہی مسلسل تلاوت و قرات میں پڑھتے چلے آئے ہیں۔ ذیل میں ہم عبرانی سے متعلقہ خود اسرایل میں تحقیقات کرنے والے محققین کی تحقیق جان روس کے حوالے سے

پیش کرتے ہیں، جسے سے ہمارے بیانیہ کی بنیاد سمجھنے میں آسانی میسر آئے گی۔

جان روس فنکل ستاین اور سلبرمان کے ذریعہ کہتا ہے کہ:

"انہیں دسویں صدی قبل مسیح کی کسی اسرایلی ادبی سرگرمی کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔[19] ان دونوں ماہرین آثار قدیمہ کو کسی ادبی سرگرمی کی دریافت کے ضمن میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ ان کو متعلقہ اخباری عمارتوں کی دریافت و بنیاد کے سلسلہ میں بھی منہ کی کھانی پڑی ایسا نہیں ہے کہ انہیں سرے سے کوئی قدیم عمارت میسر نہیں آئی تھی، مگر ہیکل سلیمانی، داود و سلیمانؑ کی تعمیر کردہ عمارتوں کے ضمن میں کوئی قوی شہادی اثر اور انکشاف توکم از کم نمودار نہیں ہو سکا ہے، بلکہ مٹی کے سادہ برتنوں کے ٹکڑے تک دل کو تھنڈا کرنے کا سبب نا بن سکے، ایسی کسی خواہش کی تکمیل کا مزہ یروشلم کی بار بار کھدائی کی صورت میں نکلا، چناچہ قیاس یہی ہے کہ وہ یروشلم دسویں صدی میں بہت قلیل الرقبہ اور قلیل الآبادی تھا، چناچہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے کہ داود و سلیمانؑ کے قصص کچھ انتہائی تخلیقی ازہان کے تراشیدہ من گھڑت قصص کے ماسوا کچھ نہیں ہیں"۔[20]

قرانی داود و سلیمانؑ، اور یہودی، فکشنی داود و سلیمانؑ کی تفریق:

ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان قران و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں داودؑ و سلیمانؑ کو عظیم انبیا کرام تصور کرتے ہیں، جو گناہوں سے مبرا اللہ کے عبادت گزار ملوک انبیا کرام تھے، جبکہ یہودی انہیں سب ملوک یا بادشاہ مانتے ہیں، ان کا اس تصور سے فرع شدہ تصور ان دونوں کی کافی نازیبا، گستاخانہ تصویر کشی کرتا ملتا ہے۔

حدیہ کہ اسٹاین اور سلبرمان کے رفیق پروفیسر ہرزاگ کے مطابق:

"ماہرین آثار قدیمہ نے اسرائیل میں کی جانے والی کھدائیوں سے سبق سیکھا کہ چونکہ کچھ ملا ہی نہیں ہے، جبھی اغلبًا نا اسرایئلی کبھی مصر میں رہے، نا انھونے کبھی صحرا نوردی کی، نا ہی فوجی مہم جوئی سے فتح حاصل کی اور نا ہی اسے بارہ قبایل تک منتقل کیا گیا بلکہ داودؑ اور سلیمانؑ کی بایبل کی قرار کردہ علاقائی طاقت زیادہ سے زیادہ ایک چھوٹی قبایلی بادشاہت کے ماسوا کچھ نہیں تھی ،یعنی کہ توریتی، ابرہام، موسی، جوشوا، داود و سلیمان علیہ السلام وغیرہ زیادہ سے زیادہ قبایلی سردار تھے۔[21] بلکہ جان روس اس حد تک چلا جاتا ہے کہ آٹھویں صدی قبل مسیح کی یہوواہ ریاست فطرت کے لحاظ سے بت پرست ثنویت کی حامل تھی"۔[22]

یہ ہے وہ فکری بنیادیں جن کی بنیاد پر بہت سے مستشرقین و پادری قران پر سرقہ و اخذ کا الزام عاید کرتے ہیں، اور سرقہ و اخذ کے لئے وہ منگھڑت مخطوطات، و تحریریں دسویں صدی قبل مسیح سے تعلق رکھنے کا دعوی کرتے ہیں، تاکہ عربی پر تحریری طور پر عبرانی ادب کی قدامت ظاہر کی جاسکے۔ یہود و نصاری جس قسم کے داود و سلیمان کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ داود و سلیمان مسلمانوں کے داود و سلیمان کے کرداروں سے الٹ واقع ہوئے ہیں، چناچہ اسی قسم کے عشق و محبت کی پینگیں بڑھاتے ہوئے داود کی تصویر کشی نیٹ فلکس کی

سیریز ہاوس آف ڈیوڈ میں کی گئی ہے۔ ان کی کتابوں میں داود اپنے سالاروں کی بیویاں ہتھیاتا نظر آتا ہے۔ جبکہ قران و حدیث کے داودؑ اس کے بر خلاف، عبادت گزار، اطاعت گزار، دلیر، شجاع، صوم و صلاۃ کے پابند نظر آتے ہیں۔ جب ان مستشرقین کے قول کے مطابق نبی اکرم ﷺ نے یہود و نصاری سے علم سیکھ کر قران لکھا تھا، تو پھر وہ کچھ کیوں نہیں لکھا جیسے توریت، انجیل، شناہ و تالمود میں بیان کیا گیا ہے، بلکہ بادی النظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تالمود لکھنے والے ربیوں نے خود عہد نامہ قدیم کے مواد سے کافی انحراف کیا تھا۔

لہذا جبھی بقول جان روس ہمیں اسٹاین وسلبرمان سے اتفاق کرنا ہو گا کہ:

لاثانی، ادبی اور روحانی قابلیت کی حامل کتاب مقدس، ایک عظیم رزمیہ داستان ہے، جس میں بہت سی قابل ودر تاریخی تحریروں، یاداشتوں، روایات، لوک داستانوں، واقعات، شاہی پروپگینڈے، پیغمبری اور قدیم شاعری کے مجموعوں کو باہم ترتیب دے دیا گیا ہے۔[23]

اب نظم قران کی ترتیب و تدوین پر معترض افراد سے پوچھا جائے کہ جس نمونے کو سامنے رکھ کر، معیار سمجھ کر یہ کھیل تماشہ کھیلا گیا اس کا اپنا رتبہ و معیار خود اسرایلی ماہرین آثار قدیمہ کی نگاہ میں کیا ہے؟

متعلقہ آن لاین مواد کی حیثیت و حقیقت:

چناچہ عبرانی کے ضمن میں کچھ یار لوگ یا توریت و انجیل کے نسخہ جات کی قدامت کو پندرہ سو قبل مسیح تک لے جاتے ہیں اور کچھ آٹھ سو قبل مسیح تک ملانے کی کوشش کرتے ہیں، یعنی یہ موسی کے دور کے تعین میں عدم یقینیت کو جنم دیتے ہیں، اکثر موسی و یوسف علیہ السلام اجمعین کے ہم زمانہ یا قربت زمانہ کا گمان ہونے لگتا ہے، اور کچھ سلیمانؑ کے دور تک براہ راست علمیاتی چھلانگ لگانے لگتے ہیں، مگر یہ سب محض ان کے خود ساختہ ظن و تخمین ہیں، جیسے بائبل سے 1650 میں ارچ بشپ اشر نے غلط اندازے لگا کر دنیا کی عمر یسوع مسیح کی پیدایش سے چار ہزار چار سو سال قدیم قرار دی تھی[24]، اس کی بات مان لی جائے تو دنیا بس چھ سات ہزار سال پرانی لگتی ہے، مغرب اس امر پر ایمان رکھتا تھا، پھر پیٹریسن نے سیسہ پر تحقیق کے دوران دنیا کی عمر سالوں کی تحقیق کے بعد ساڑے چار ارب سال تخمیناً بیان کی حلانکہ جاو اسے ملنے والی کھوپڑی کی عمر جو انسانی کھوپڑی سے جاوامین سے مماثلت رکھتی ہے کی عمر کچھ ماہرین پانچ لاکھ سال بیان کرتے ہیں، آرچ بشپ نے اس ضمن میں مزے کی بات یہ ہے کہ بنوکدنضر کی عمر سے دنیا کی عمر متعین کرنا چاہی تھی، جبکہ ناچیز کی رو سے دنیا کی معلوم ریاست کا تاریخی گمان دس ہزار سال قدیم ہے، اور مزید مواد تحقیق اس گمان کو مزید آگے پیچھے کر سکتی ہے، اس کی اصلاح و تردید کر سکتی ہے، جس کی بابت میں نے اپنے مقالہ میں اشارہ کیا ہے، حقیقت میں ایسا کچھ مواد حمایت میں قدامت کے تناظر میں زبانی کلامی باتوں کے ماسوا، میسر نہیں آتا ہے، اصل میں تحریر کے یہ نمونہ جات پہلی صدی قبل مسیح سے پہلی عیسویں کے درمیاں ہی مشہود ہوتے نظر آتے ہیں، چناچہ یوال نوح حراری تبصرہ کرتا ہوئے کہتا ہے کہ:

"پہلی صدی قبل مسیح کے دوران، یہودی، نبیوں، کانوں اور علمانے کہانیوں، دستاویزات، پیش گوئیوں، نظموں، دعاوں، اور تاریخ کے واقعات کا ایک وسیع مجموعہ تیار کیا، بائبل بطور واحد ایک مقدس کتاب بائبل کے زمانے میں موجود نہیں تھی،۔ بادشاہ داود یا پیغمبر یسیعاہ نے کبھی بائبل کی ایک نقل نہیں دیکھی تھی، بعض اوقات غلطی سے دعوی کیا جاتا ہے کہ قدیم بائبل کی قدیم ترین بچ جانے والی نقل بحیرہ مردار کے طوماروں سے آئی ہے، یہ طومار تقریبا نو سو مختلیف دستاویزات کا مجموعہ ہیں،، جو زیادہ تر گزشتہ دو صدیوں قبل مسیح میں لکھے گئے تھے، اور بحیرہ مردار کے قریب ایک گاوں قمران کے آس پاس مختلیف غاروں میں پائے گئے تھے،، زیادہ تر علما کا خیال ہے کہ وہ ایک یہودی فرقہ کے ارکا یو تھے جو قریب ہی رہتے تھے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ کسی بھی طومار میں بائبل کی ایک بھی نقل نہیں ملتی ہے۔ اور کوئی بھی طومار اس بات کی نشاندہی نہیں کرتا ہے کہ عہد نامہ قدیم کی چوبیس کتابوں کو ایک واحد اور مکمل ڈیٹا بیس سمجھا جاتا تھا"۔[25]

اس بحث سے اتنا بخوبی سمجھ آگیا ہو گا کہ جس کلیہ و تقابلہ کو بنیاد بنا کر عبرانی قدامت کی عمارت سازی کی جارہی ہے، وہ خود اپنے اندرونی حلقوں کے معروف محققوں کے نزدیک اس ہیت و کیفیت کا حامل نہیں رہا ہے کہ دلیل بن سکے بلکہ، اگر اسپر نگر، مارگیولث، میورو جیفری آج زندہ ہو کر جدید تحقیقات بلخصوص آرکیولوجیکل اور بشریاتی تحقیقات پڑھیں تو انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ان کے اعتراضات و تحقیقات جن مقدمات پر کھڑیں تھیں وہ سب خود نقد کی دنیا میں قابل نقد سمجھی جارہیں، ان کا تقابلہ علمی کم تھا، عصبتی تعصب سے زیادہ پر زیادہ نظر آتا ہے۔ چناچہ اگر عربی تحریر سے زبان و تقریر کے درجہ پر عربوں میں موجود تھی، تو خود بائبل و توریت بھی اس وقت قدما کے یہاں تقریر سے خارج تحریر کے احاطے میں آنہیں پائی تھیں۔

عبرانی کا عروج وزوال:

عبرانی زبان کے زوال کی بابت بتایا جاتا ہے کہ یہ بابلی حکمران وفاتح بنوکد نظر کی 586 قبل مسیح کی فتح یروشلم کے ساتھ شروع ہوا تھا اگر یوال نوح حراری جیسے اسرایلی ہیبریو جامعہ کے پروفیسر کی بات پڑھیں تو سمجھ آئے گا عبرانی تحریری مواد تو سرے سے شروع سے موجود نہیں تھا یہاں تک کہ وہ اشارہ دیتا ہے کہ داود و سلیمانؑ کو بھی ایسی کسی تحریری توریت کی خبر نہیں تھی خیر یہودی قوم کی تباہی میں بنو کد نصر کا بہت اہم کردار ہے اول ہیکل سلیمانی کو تباہ بھی اس نے کیا تھا اور دانیال نبی سمیت بنی اسرایل کی بڑی تعداد کو غلام بنا کر وہ بابل لے گیا تھا، اسی دوران توریت بس کچھ کاہنوں کے اذہان میں موجود تھی، یہیں سے ہمیں بہت سوں کے نزدیک آرامی اور بنی اسرایل کے تعلق کی ابتدا کی داستان سنائی دیتی ہے، کہا جاتا ہے کہ بابلی سلطنت کی مروجہ رسمی زبان آرامی تھی، کچھ نے اس کو سلطنت کی دوسری زیادہ بولے جانے والی زبان کہا ہے[26]۔

جسے دورانِ جلاوطنی یہودیوں نے اپنا لیا تھا، اس طرح عبرانی زبان یہودیوں کی بول چال کی زبان کے طور پر متروک ہونے لگی، آرامی بھی بلذات شمال مغربی زبان ہے، جو عبرانی سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ چند عشروں کے بعد ایرانی بادشاہ سایسرس نے جب

بابلی سلطنت فتح کی تو آزامی زبان کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کر دیا۔[27] جب یہودی سو ڈیڑھ سو سال بعد اپنے علاقوں کی طرف پلٹے تو زند و آرامی زبانوں سے واقفیت سے ان کی اصل بولی و توریت خطرے کا شکار ہونے لگی، نئی نسل نا زبانی توراہ اور اس میں موجود اخلاقی پیغامات سے واقف تھی، اور نا یہودیت کی حقیقی اساس سے واقف تھی، اب تک توریت زبانی و کلامی پائی جاتی تھی، وہ بھی انبیا بنی اسرایل کے شاگرد کچھ کاہنوں کو معلوم تھی، اوپر حراری کا بیان بھی موید ہے کہ انھونے کبھی تحریری تورات سرے سے دیکھی ہی نہیں تھی۔ حد یہ کہ وہ اس ضمن میں الزام داود و سلیمانؑ تک وسیع کر دیتا ہے، یہ باتیں شاید ایک یہودی و عیسائی سے تو ہضم ہو جائیں مگر مسلمانوں سے ہضم کرنا مشکل ہے، یہاں دریافت کیا جاسکتا ہے کہ وہ نبی جو امی تھا جس کو تقابلی ادیان کی کچھ خاص معلومات تک نہیں تھی، کیسے یہود و نصاری سے بلکل ہٹ کر وہ کردار و پیغام انبیا کرام کای بابت اس دور کی یہود و نصاری کی روایات کے مقابل الٹ بیان کر دیتا ہے، جس کی خبر تو چھوڑیں جس کا تصور تک اس دور کے یہودیوں کے دماغوں میں موجود نہیں تھا، اس نے اپنے ملزم استادوں کی تعلیم سے ہٹ کر کیوں ان کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ اگر یہ سب مطالعہ، تحقیق، یا کسی سے سیکھا گیا علم تھا تو اس دنیا کے یہود و نصاری کے ان کے بابت تصورات و نتایج کیوں اس سے الٹ تھے؟

خیر یہودی پود اپنی اصل ثقافت سے لاتعلق ہو رہی تھی، چناچہ ربیوں نے اس کو تحریر میں لانے کا فیصلہ کیا۔ یہ کارنامہ ایک فرد کی دین ہے، چناچہ ربی یہودہ کی پیدائش تقریباً 135 عیسوی میں ہوئی اور 217 عیسویں میں ان کی وفات ہوئی۔ وہ عظیم ربی گملیئل دوم کے پوتے تھے، اور ان کا تعلق عظیم داود کے خاندان سے بتایا جاتا ہے، ربی یہودہ ہناسی کا سب سے عظیم کارنامہ مشنہ[28] کو مرتب کرنا اور اسے تحریری شکل دینا ہے۔ 70 قبل مسیح کے دوران دوسرے معبد کی تباہی کے بعد تو یہ خطرہ اور بڑھ گیا تھا، زبان و مذہب کی وہ مشترکہ اقدار ہی خطے کا شکار تھیں جو قوم میں وحدت پیدا کرتیں۔ چناچہ ربی یہوداہ ہاناسی[29] یہودیوں اور فری میسن کی تاریخ کے پانچ اہم ترین افراد میں سے ایک ہیں، بہت سے انہیں الٹا داود و سلیمانؑ کو بھی ہٹا کر موسیٰؑ کے بعد اہم ترین فرد مانتے ہیں، کچھ ان کے ساتھ ہیران ایبف (معمار ہیکل سلیمانی) کو بھی سلیمانؑ سے بھی اہم مانتے ہیں۔ سمجھیں کہ دانیال نبی نے جو کام بابل کی جلاوطنی میں کرنے کی کوشش کی تھی اسے عملی شکل ربی یہوداہ ہاناسی نے دیای تھی۔ انھونے زبانی توراہ کو تحریری توراہ یعنی مشناہ کی شکل دی تھی جس کے سبب یہودیوں میں عبرانی زندہ کرنے کا کچھ صدیوں کے لئے تحریری اثاثہ فراہم کر دیا گیا، مشناہ اصل میں زبانی توراہ کا تحریر مختصر اخلاقی منظر نامہ ہے۔ ربی یہودہ ہناسی نے تمام زبانی روایات، قوانین، بحثوں اور تعلیمات کو جمع کیا جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔۔ مشنہ کی تدوین نے یہودی قانون کو تباہی سے بچالیا اور اسے ایک مستقل بنیاد فراہم کی۔ یہ بعد میں آنے والے تمام یہودی قانونی ادب، جیسے تلمود وغیرہ کی بنیاد بنی۔ یاد رہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ اس توریت پر ہے جو موسیٰؑ پر اتری تھی، موجودہ توریت یا عہد نامہ قدیم ایک صدیوں کے ارتقا، تحریف و اضافہ جات کا مجموعہ کلام ہے، جس میں اصل توریت کا بھی کچھ حصہ پایا جاتا ہے۔ لہذا یہ وہ توریت نہیں ہے جس کے آسمانی کتاب ہونے کا مسلمان اعتقاد رکھتے ہیں اور

یہی معاملہ عیسائیوں کی عہد نامہ جدید کا بھی ہے، اسی طرف کچھ اشارہ امام ابن حزمؒ نے اپنی کتاب الملل والنحل میں کیا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ ربی یہوداہاناسی گھر میں عبرانی بولا کرتے تھے، اور اور تالمود بتاتی ہے کہ ان کے گھر والے تو چھوڑیں ان کی نوکرانی تک اس ضمن میں اتنی ماہر تھی کہ، ان کے اب شاگرد ابھی اپنی بھول چوک کی اصلاح کے لئے اسی سے رجوع کیا کرتے تھے۔[30] اس سے یہ فایدہ حاصل ہوا کہ یہودیوں کو دربدر بھٹکنے کے دوران مشنہ و تالمود کے سبب اپنی عبرانی زبان سے واقفیت حاصل ہوگئی، اس زبان، ان کتب میں موجود دعاوں، قصوں، اصولوں، رسم ورواج نے یہودیوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا کردی، مگر یہودی نسل میں یہ جدت آتی جارہی تھی، کہ وہ ماضی کے بجائے حال میں جینے کے چکر میں اپنی مذہبی و ثقافتی زبان سے دور ہوتی جارہی تھی، چناچہ یہ قوم جس جگہ جاتی اسی جگہ کی زبان اپناتی اور اسی میں گفتگو کرنے لگتی، عبرانی زبان دو ہزار سالوں میں بس گنتی کے کچھ ربیوں کو سمجھ آتی تھی، وہ ہی اس کو بولا یا لکھا کرتے تھے، ربیوں کا ہی اس پر غلبہ قایم تھا۔

عبرانی تاریخ میں دوسرا بڑا نام ربی الیعزر بن یہودہ (1858-1922) ایک لسانی دانشور، اخبار نویس اور جدید عبرانی زبان کے احیاء کا معمار سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک ایسی زبان جو صرف مذہبی اور ادبی مقاصد تک محدود تھی، اسے زندہ روزمرہ کی بول چال کی زبان میں تبدیل کرنے کا تاریخی کام سرانجام دیا۔ وہ مسلسل ایک راگ الاپا کرتے تھے، جلد یہودی قوم یہاں فلسطین کی سرزمین پر واپس آئے گی، اور اپنی اصلی قدیمی مادری زبان بولے گی، ہمیں بس اسی کے لئے ماحول ساز گار بنانا ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ ایک مشترکہ زبان کے بغیر وحدتِ یہودیت کا تصور ناممکن ہے۔

بن یہودہ اور ان کی پہلی بیوی دیورا نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے گھر میں صرف عبرانی زبان بولیں گے۔ ان کا بیٹا، بن-زیون بن یہودہ (جس کا نام ایتامار بھی تھا)، جدید دور میں پہلا شخص تھا جس کی مادری زبان عبرانی تھی۔ اسے بچپن سے ہی آگے کے لئے تیار کیا گیا تھا، اور اسے بس عبرانی ہی سکھائی گئی تھی، چناچہ اسے دیگر زبانوں سے مکمل طور پر دور رکھا گیا۔ تاکہ یہ پہلا یہودی مادری بچہ دوسروں کے لئے مشعل راہ بن سکے۔ جدید دور کے تصورات، ایجادات اور روزمرہ کی چیزوں کے لیے قدیم عبرانی میں الفاظ موجود نہیں تھے (جیسے "آئس کریم"، "ٹماٹر"، "بائیسکل"، "اخبار" وغیرہ) لہذا بن یہودہ نے ہزاروں نئے الفاظ اختراع کیے۔ انہوں نے الفاظ بنانے کے لیے عبرانی جڑوں، ساختوں اور دوسری سامی زبانوں جیسے عربی و آرامی وغیرہ کو مد نظر رکھا۔ نہوں نے "ہا-زوی[31]" نامی ایک اخبار جاری کیا، جو مکمل طور پر عبرانی میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار نے نہ صرف خبریں پہنچائیں بلکہ نئے ایجاد کردہ الفاظ کو عوام تک پہنچانے کا کام بھی کیا۔

عبرانی لغت سازی کی کہانی: ایک اہم سبق جسے قوم سازی کے ضمن میں قابل توجہ سمجھنا چاہئے: اب ان کو احساس ہوا کہ یہ زبانی تعلیم و تربیت کا سلسلہ تب تک اگے مضبوط بنیادوں پر قایم نہیں ہوسکتا ہے کہ جب تک کہ کوئی معیاری عبرانی مسبوط لغت تیار نا ہوجائے لہذا انھونے اسرایل بننے سے قبل اس کی تیاریاں شروع کردیں۔ ملّون ہا-لاشون ہا-عوْرِیت "(عبرانی زبان کی مکمل لغت)۔ کی تیاری ان کا ایک

بڑا کارنامہ گردانا جاتا ہے۔ یہ ایک وسیع اور تاریخی لغت تھی جس میں تمام تاریخی ادوار (بائبل، مشنہ، وسطی دور) کی عبرانی کے ساتھ ساتھ ان کے خود اختراع کردہ نئے الفاظ بھی شامل تھے۔

یہ کام ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکا، لیکن ان کی وفات کے بعد ان کی بیوی اور ساتھیوں نے اسے جاری رکھا۔ آج یہ عبرانی زبان شناسی کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔ بن یہوداہ کو ان کی بیوی دیورا اور بیٹے کی مدد حاصل تھی، مالی مشکلات کے علاوہ مذہبی طبقہ نے بھی اس امر کی مخالفت کی کہ یہ ایک مقدس زبان ہے جسے بس مذہبی طبقہ کو سمجھنا بولنا چاہئے اور وہی مقدس رسومات کی ادائیگی کے ضمن میں اس کو بول و لکھ سکتے ہیں۔

حیران کن بات یہ ہے کہ ہندوستان میں بھی کچھ لوگ انہی کے دور میں عبرانی کی کچھ سمجھ ولیاقت رکھتے تھے، جن میں ایک نمایاں نام سید احمد خان کا ہے، ان کو یہ لیاقت اور شد بد کہاں سے میسر آئی، یہ بحر حال ایک حیران کن بات ہے، مگر یاد رکھیں کہ ہندوستان میں یہودی جب بھی بستے تھے اور آج بھی قلیل تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ العیزر بن یہوداہ نے اپنی انتھک محنت اور خداداد صلاحیتوں سے ایک مردہ ومتروک زبان کو زندہ کرکے، اس قوم کی تشکیل کی جسے آگے چل کر ایک نسل کش قوم بننا تھا، اہم سوال یہ ہے کہ ان سمیت بہت سے یہودی 1948 سے عرصہ قبل، بلکہ بلفور اعلامیہ 1917 سے قبل کیسے ادراک کرگئے تھے، کہ یہودی وطن حقیقت دھارلیگا اور وہ بھی ان کے من پسند علاقے میں؟

عربی کو کیوں مستشرقین حادث بنانے کی کوشش میں تھے؟

غور طلب بات یہ ہے کہ تفتیش سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اندرونی تحریک، زیرزمین قوت، یہودیوں کو نئے وطن کے عنقریب وجود میں آنے کی یقین دھانی کرا چکی تھی، مگر وہ قوت کون ہے اس کا فیصلہ کرنا باقی ہے، جنگ عظیم اول، سویت یونین کا قیام، اشتراکی ازم کا ریاستی رخ، اعلان بلفور، جرمنوں اور ترکوں کی شکست، مصطفی کمال کا عروج کا، عثمانی خلافت کا خاتمہ، سب کسی خط مستقیم کے منصوبے کی نوید تھیں جس کو عملی شکل ملنے کے لئے جنگ عظیم دویم کے خاتمے، امریکہ کے عروج، برطانیہ کے زوال، ہندوستان کی تقسیم، اور اسرایل و اقوام متحدہ کے قیام سے ملا کر دیکھیں تو بہت کچھ سمجھ آجایگا۔

ربی العزر کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ انھونے یہ ضد بنالی تھی کہ فلسطین پہنچ کر اب میں بس عبرانی ہی بولوں گا۔ چناچہ اپنے جاننے والوں سے وہ اسی زبان میں گفت وشنید کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انھونے اس لغت کے مادوں کی تحقیق کے ضمن میں عربی سے تاریخی دوری بنائے رکھی، جب تک عبرانی کے پاس آٹھ ہزار لفظوں کا ذخیرہ تھا جسے مابعد سترہ جلدوں کی لغت تک وسعت دی گئی۔ واضح رہے کہ مغرب کے عیسائی، یہودی پادری وربی ہوں یا سیکولر ملحدین ہوں ہر ایک کا ماننا ہے کہ عربی عبرانی کی فرع اس سے متاثر شدہ ہے۔ اگر آپ عربی کو زبانی، کلامی، یاداشت، سے لے کر نبطی تختیوں سے سبع معلقات تک پھر قران سے طوق الحمامہ تک دیکھیں تو اپ کو عبرانی زبان کے

ارتقا و دعوے پر ہنسی آئے گی، عربی ہمیشہ خط مستقیم پر زبانی سے تحریر تک موجود رہی، کبھی متروک و ضعف نہیں ہوئی، جبکہ اس کے برخلاف عبرانی ہر دور میں ناپید ہونے محدود ہونے کی حالت میں رہی، عربی و عبرانی بولنے پڑھنے والوں کی تعداد میں جو فرق ہے وہ بھی بہت عظیم پایا جاتا ہے۔ اصل میں عبرانی ساخت سے تحریر تک کی قدامت کا مفروضہ عربی و قران کو عبرانی توریت کی نقل گردانے کے لئے گھڑا گیا ہے۔

اب اگر دسویں صدی قبل مسیح کے دعوے کو دیکھیں تو معلوم ہو گا، اس کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔ جس طرح عربی تحریر کا آغاز پہلی صدی عیسویں میں محدود کیا جاتا ہے عین ویسے ربی یہوداہاناسی کی پیدایش اور کام بھی اس کے اریب قریب کا ہے، واضح رہے کہ علامہ شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی دونوں کی تحقیق یہی ہے کہ عربی عبرانی سے قدیم زبان ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ زبان ابراہیمؑ سے بھی قدیم ہے اور یمن تک میں یہ زبان بولی جاتی تھی۔

کیسے ایک استاد نے عبرانی کی ترقی کو آگے بڑھایا؟

اس بابت وضاحت بعد میں آئے گی، چناچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عبرانی استاد بیان کرتا ہے کہ کیسے انھونے صفر سے کام شروع کیا اور کیسے دل و جان سے ناممکن سے ممکن کر دکھایا، چناچہ داود یودالوے کا کہنا تھا کہ لوگوں کو اس وقت کے حالات کی خبر ہی نہیں ہے،، کتابوں کی قلت، سیکڑوں الفاظ ہونے کے باوجود، اسم، فعل، اور محاورات نہ ہونے کے باوجود ہن نے پڑھانا شروع کی، ہم نیم گونگوں کی طرح ہکلاتے ہوئے ہاتھوں، اور آنکھوں کے اشاروں سے باتیں کیا کرتے تھے؟[32]

یہاں اول تو ایک قوم کے اس عظم کو سراہنا چاہئے کہ کیسے اس نے اپنی زبان، وحدت، ثقافت کی تشکیل کے لئے کتنی محنت اور دور اندیشی سے کام لیا، وہیں اسی قوم کے حامی اور ہمدرد بھول جاتے ہیں کہ جو زبان دو ہزار سالوں میں ہر چار پانچ سو سال میں متروک ہونے لگتی ہو، اس کے الفاظات بار بار اختراع کئے جاتے ہوں، جس کے ذخیرہ الفاظ کو چھپنا ہونے کے سبب جستجو سے واپس لایا جاتا ہو، جس کے صرف و نحو اور گرامر کے اصول تک موجود نا ہوں حد یہ کے جب مستشرقین عربی زبان، قران، اسلام پر حملے کر رہے تھے، تب سلطنت عثمانیہ زوال کے آخری درجہ ہر پہنچی ہوئی تھی، یورپی طاقتیں، دنیا پر قابض و غالب تھیں، جب یہودی صیہونیت پروان چڑھنا شروع ہو رہی تھی، تب بڑی طاقتوں پر ظاہری وان دیکھے ہاتھ دباو ڈال رہے تھے، کہ مسلمانوں پر غلبہ پانا ہے، انہیں ہمیشہ زیر دست رکھنا ہے تو عربوں کو دباو میں رکھنے کے لئے ایک ریاست کو ان کے ہی قلب میں، ان کے ہی علاقوں پر قایم کرنا ہے، تو اسی قوم کی مردہ متروک زبان کو بھی ساتھ ساتھ تیار کیا جارہا تھا، اور مستشرقین کہہ رہے تھے، کہ یہ زبان عربی سے قدیم ہے، اور عربی اسی سے نکلی ہے، مگر وہ زبان اس دعوے کے دور میں خود طفلیت سے جوانی کی طرف بڑھ رہی تھی، جبکہ عربی جو اس کی فرع تھی صدیوں سے محفوظ، اور دن بہ دن پھل پھول رہی تھی، اس کا ذخیرہ الفاظ مسلسل بڑھ رہا تھا، اس کے قدیم الفاظ ہمیشہ سے محفوظ چلے آرہے تھے، اس کی گت، زبان، شاعری کل مشرق میں

پڑھی، سمجھی، اور بولی جاتی تھی، یہ وہ دور تھا کہ دینی مدارس ہر طرف پروان چڑھ رہے تھے، ہندوستان میں تو یہ مدارس بام عروج پر پہنچے ہوئے تھے، اور مستشرقین ان کو وہ الٹی کہانی سنا رہے تھے، جس کا نا کوئی سر تھا نا پاوں۔

خیر ایک مشہور استاد، یہودی سیاستدان داود یلین [33] ایک ممتاز یہودی ماہرِ تعلیم، لسانیات دان، اور عبرانی زبان کی احیاء کے علمبر دار تھا۔ اس نے جدید عبرانی زبان کی تدریس کی بنیاد رکھی اور یروشلم میں کئی تعلیمی ادارے قائم کیے تھے، وہ عثمانی مقننہ کا ایک یہودی رکن بھی تھا۔ اس نے مابعد کھل کر صیہونیت کی حمایت کی، اس کا دادا دراصل 1834 میں پولینڈ سے فلسطین آیا تھا پھر اس خاندان، عبرانی زبان کی ترویج اور صیہونیت کے لئے انتھک محنت کی، اس نے عبرانی مدرسہ بھی قایم کیا تھا، 1920 میں اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ اس نے عبرانی زبان کی لغت شایع کی تھی، یہ دور الیعزر بن یہوداہ کا آخری دور تھا، اس نے نا صرف عبرانی زبان پر تحقیق و تفتیش میں حصہ لیا، بلکہ اس کے احیا میں اہم کردار ادا کیا، اس کے نام پر یروشلم میں ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ قائم [34] ہے، جو آج بھی عبرانی تدریس میں سرگرم ہے۔ [35]

اس کا کہنا ہے کہ:

" یہ وہ دور تھا ہر استاد کے پاس عبرانی کی بجائے، روسی یا فرانسیسی میں کتاب ہوا کرتی تھی، اور اسے عبرانی میں پڑھانے کا کام سرانجام دینا ہوتا تھا،، بلکہ درسی اصطلاحات تک موجود نہیں تھیں، دیہاتی مدارس کا ہر استاد عبرانی زبان کی اکادمی کا درجہ رکھتا تھا، وہ اپنی پسند اور ذوق کے مطابق الفاظ وضع کرتا اور اپنی تحقیقات پڑھانے کی کوشش کرتا تھا، تاہم وقت کے ساتھ ساتھ مسایل خود حل ہوتے گئے، ایک نوزایدہ عبرانی زبان بولنے والی نسل وجود میں آگئی، تو سب کو یقین ہونے لگا کہ زبان کا احیا کامیابی کا منہ دیکھنے کے قابل ہو گیا ہے"۔ [36]

عربی و عبرانی عقل و منطق، حقایق کس کے ساتھ ہیں؟

یہ ہے اس عظیم الشان عبرانی کی کہانی جس سے عربی کے نکلنے اور پیدا ہونے، اور قدیم ہونے کا دعوی کیا گیا ہے، مگر اس کے لئے استادوں نے، من مرضی سے جو چاہا پڑھا کر ایک پود تخلیقِ اسرایل سے قبل تیار کی اور گرامر بھی خود سے اختراع کر لی، جس کے پاس مزے کی بات یہ ہے کہ درسی اصطلاحات تک موجود نہیں تھی۔ اور اس عمل سے قبل ہی انیسویں صدی کے آخر دور میں مستشرقین ایک خیالی ذہنی حالت تشکیل کر کے، من چاہئے خیالی پلاو پکا رہے تھے، جب وہ زبان خود زبان کے مدرسین و اختراع سازوں کے نزدیک ایک یا یک سے زیادہ عہدوں میں موجود نہیں تھی، تو یہ مستشرقین اور ماہرین لسانیات کیسے اس طرح کے دعوے کرنے میں مشغول تھے؟ اور کس منہ سے، کس معیار کو خارج میں سامنے رکھ کر قیاس آرائی میں مصروف تھے؟۔

سوال یہ ہے کہ لغت کی تشکیل سے قبل ایسا دعوی کیسے کیا جا سکتا تھا؟ جبکہ قدیم جڑ ڈھونڈھیں تو بقول یوال نوح حراری داود و سلیمانؑ تک نے توریت کی کوئی شکل ہی سرے سے دیکھی نہیں تھی۔ یوال نوح حراری سمیت کئی محققین کا اجماعی موقف تو یہ ہے کہ ربی

یہودہ ناہاسی سے قبل توریت زبانی ہی پائی جاتی تھی۔ اس تناظر میں عبرانی و عربی کا تحریری سفر قریب الزمانہ ہے، اور زبانی دور میں عربی عبرانی سے قدیم ہے، اور صدیوں سے بنا متوک ہوئے معدوم ہوئے مسلسل زندہ کمیت و کیفیت میں زندہ زبان کی صورت میں موجود رہی ہے، پھر بھی مستشرقین سے حقیقت تسلیم نہیں ہو رہی ہے۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ عبرانی و عربی ایک ہی چشمہ سے پھوٹی ہیں اور اس سے دو خاندان دو الگ دبستان فکر نکلے ہیں، چناچہ ان کی ابتدا کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے، مگر قیاس یہ ہے کہ عربی ابراہیم سے قبل کی زبان اور لوگ ہیں، اور عاد و ثمود قدیم عرب ہیں جنکا دور ابراہیمؑ سے مقدم سمجھ و قدیم گردانا جاتا ہے،

موسیو لیبان نے بھی تسلیم کر کے کہا ہے کہ:

"عربوں کی قدیم سے قدیم روایت ابراہیمؑ سے آگے نہیں بڑھتی ہیں، لیکن علم السنہ کی تحقیات بتاتی ہیں کہ نہایت قدیم زمانہ میں کل اس خطہ میں جو قفقاز اور عربستان کے بیچ واقع ہے، اگر ایک قوم نہیں بستی تھیں تو کم ازم کم کچھ اقوام جو متحد السان تھیں ضرور بسا کرتی تھیں۔ سیمیٹک زبانوں کے باہمی مقابلہ سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ عبرانی، فینیقی، اسیری، کلدانی اور عربی کسی زمانہ قدیم میں متحد الاصل اور ایک زبان سے نکلی تھیں۔ مذید یہ کہ زمانہ جاہلیت کے قدیم عربوں کی تاریخ کی بابت کچھ ہمیں کتاب توریت سے معلوم پڑتا ہے۔ اور کچھ قدیم عربی روایتوں، نادر تصنیفات جو روم و یونان سے ملی ہیں، یا چند محدود کتبوں سے جو دما (عمان کا شہر)، صفا (بحرین کا قلعہ) کے قریب ملے ہین، کتب توارات سے معلوم پڑتا ہے کہ عربوں و عبرانیوں کی اصل ایک ہے، اور عرب قدامت میں عبرانیوں سے زیادہ سمجھے گئے ہیں۔، ان کی باہمی خانہ جنگیاں طویلؑ رصہ جاری رہیں، بلکہ توریت میں برابر جزیرہ نما سینا کی اقوام، عمالقہ، مداین اور سابیین عربستان کا ذکر پایا جاتا ہے۔

یہودی کتب میں عربوں کی بابت جو قدیم روایتیں ملتی ہیں، سے معلوم پڑتا ہے کہ جزیرہ العرب میں پہلے دو نسلیں قایم ہوئیں، ایک یقطان اولاد سام دوسری اسمعیل بن ابراہیم کی جو ان کی لونڈی حاجرہ کے بیٹے تھے،، ان میں شمال کی طرح بدوی رہتے تھے، اور جنوب کی طرف مستوطنین۔ یمن میں یقطان کی نسل سے ایک طرف سبا کی سلطنت قایم ہوئی۔ دوسری طرف حمیر کی سلطنت قایم ہوتی دکھتی ہے۔ اور اسمعیلؑ کی نسل فلسطین سے حجاز تک بسی اور یہی پہلے مکہ مکرمہ کے حاکم ہوئے، اور عرسہ تک مکہ اور سبائے یمن کا مقابلہ رہا کہ ان میں سے کون سا شہر عربستان کا دارالسطنت کہلائے"[37]

یہ تو اوپر تذکرہ گزرا ہے کہ نبطی رسم الخط میں قدیم عربی کتبات پائے گئے ہیں، نبطی نبطیہ قبایل سے مستشق ہے، اور اس کی جڑیں اولادِ اعمایل سے جاملتی ہے۔ واضح رہے کہ اسمعیلؑ کی پیدایش اسحقؑ سے قبل ہوئی تھی۔ اور بنی اسرایل یعقوبؑ کے ذریعہ اپنا نسب، اسحقؑ سے ملاتے ہوئے ابراہیمؑ تک جاملاتے ہیں، عہد نامہ قدیم سے صاف ظاہر ہے کہ اسمعیلؑ حاجرہ صاحبہ کے فرزند تھے، جنھیں شاہ مصر نے سارہ کو

ہبہ کیا تھا اور ان سے وہ ابراہیمؑ کو ملیں جن سے اسمعیلؑ پیدا ہوئے تھے۔[38] سارہؑ سے حاجرہؑ ہضم نہیں ہوئیں لاچار ابراہیمؑ ان کو مکہ کے آب و گیا مقام پر چھوڑ آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے بڑے فرزند اسمعیلؑ جو ابھی شیر خوار تھے وہاں گئے تھے۔ اس ضمن میں واضح کر دوں کہ یہ ساری تفصیل ہم توریت و بنی اسرایل کے قصص سے بیان کر رہے ہیں۔ ورنا بطور مسلم ہمارا اعتقاد ہے کہ ابراہیمؑ ان کو وہاں اللہ کے حکم پر مستقبل کی تاریخ کی بنیاد رکھنے، عرب کی سرزمین میں توحید کا جھنڈا گاڑنے چھوڑ کر آئے تھے۔ ورنا وہ چاہتے تو ان دونوں بیوی بچے کو مصر و شام میں بھی چھوڑ سکتے تھے، ظاہر ہے کہ بی۔بی سارہ اگر حاجرہ صاحبہ سے اگر صرف ابراہیمؑ کے قریب ہونے کے سبب ناراض تھیں تو یہ کام اسی شہر جہاں وہ رہتی تھیں۔ میں بھی الگ گھر میں رکھنے سے ممکن تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ عرب بنی اسرائیل و ابراہیمؑ سے بھی پرانے ہیں۔ اور اسمعیلؑ حجاز جاکر عربی روایت میں ڈھل گئے اور ان کی آل و اولاد بھی صدیاں گزرنے کے بعد اسی زبان و تہذیب میں ڈھلتے گئے۔ یوسفؑ کے دور کا فرعون ملک ریان بھی ہسکوسی عربی النسل تھا۔

جیسا کہ موسیو لیبان کہتا ہے کہ:

"نبطیہ۔ بنو ادوم، بنو تاب، عمالقہ، بنو عمون، اور مدیانیہ بڑے بڑے قبایل اسمعیلؑ کی اولاد میں سے تھے۔ اور ان میں سے اکثر کے نام توریت میں سے ملتے ہیں۔ وہ شاید عمالقہ ہی تھے، جنھونے دو ہزار قبل مسیح میں شام کے بدویوں کے ساتھ ملکر مصر پر چڑھائی کی تھی۔ اور وہاں چرواہوں کا شاہی خاندان قایم کیا جس نے کئی صدیوں تک وہاں حکومت کی تھی۔ بلا آخر عمالقہ، بنو ادوم، بنو ماب، اور بنو عمون نے کوہستانی عربستان اور، صحرائی عربستان میں بود و باش اختیار کی، یہ قبایل ہمیشہ عبرانیوں کے ساتھ جنگ کرتے رہے، اور ایک مدت تک انہیں ارض کنعان میں پہنچنے سے باز رکھا، صرف داود و سلیمان علیہ السلام اجمعین کے ادوار میں کچھ عرصہ کے لئے انہیں زیر نگین کیا گیا تھا۔ تورات میں جو کچھ ذکر ملتا ہے وہ اصل میں فلسطین کی بدوی اقوام سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ یمنی عربوں کے متعلق کچھ ذکر سبا کی ملکہ کے متعلق ہے جو سلیمانؑ سے ملاقات کے لئے آئی تھی۔"[39]

نتایج:

ہم اوپر کافی بحث کر کے اشارہ کر چکے ہیں کہ مستشرقین کا عربی کے آرامی و عبرانی سے موخر ہونے کا نظریہ کمزور نوعیت کا حامل ہے، اور اس کے لئے انھونے عربی کی قدامت پہلی عیسویں اور عبرانی کی دس قبل مسیح میں دکھا کر جعلی کھیل تماشہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان سب کا رد تاریخی تناظر میں اوپر کر دیا گیا ہے۔ جبکہ انھونے آرامی سے مماثلت و اخذ کا جو الزام لگایا یہ بھی کمزور فاسد خیال ہے کیونکہ اوپر بیان کر دیا گیا ہے، عبرانی تحریری اداب خود بعد از مسیح کی پیداوار ہے۔ عہد نامہ قدیم کئی دفعہ دنیا سے غایب ہوا اور یہ زبانی نوعیت کا ادب تھا، جبکہ اس کا تحریری پن اور جدید کا وجود آس پاس کا ہے۔ اور یہودی و نصاری کی باہمی اپنی اپنی ثقافت و روایت کی تشکیل کی کوشش ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نا ہو گا کہ خود آرامی، عبرانی عربی ایک ہی سامی خاندان و تعامل کے سبب ملتے جلتے الفاظوں کا ذخیرہ رکھتے

ہیں جیسا کہ اردو و ہندی میں مثالت کے باب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں مستشرقین ادب و مابعد از جدیدیت کی اس نقطہ نظر کو فراموش کر گئے کہ کلام و تقریر، تحریر سے اعلی ہوتے ہیں، اور وہ اپنی دلیل کے لئے شروع شروع میں انہی سے دلیل پکڑ کر دلالت کرتے ہیں، مگر بحر حال اتفاق و اختلاف سے قطع نظر یہ کہنا ممکن ہے کہ، جب کتاب میں اعتراضات کے رد سے زیادہ اعتراضات کرنے والے مستشرقین کی تاریخ و احوال کا بیان کرنا زیادہ مطلوب ہے جبھی قارئین کو اعتراضات سے واقف کرانا لازمی ہے۔ اس طرح کے اکثر اعتراضات کے جوابات میں مشرق و مغرب میں کثیر ادب مزاحمت میں نمودار ہو چکا ہے۔

عربی زبان کی عظمت و خوبصورتی تو خود معترضین نے بھی کہیں نا کہیں تسلیم کی ہے جیسے ایک **ہندو صاحب** فرماتے ہیں کہ:

"عربی کے دیشی و ودیشی سب عالموں کی رائے ہے کہ قران کی زبان اونچے درجے کی ہے۔ بڑی سندر، رسیلی، اور ایک طرح کی آزاد نظم یا سنتر کویتا (پوئیٹک پرور) ہے۔ قران کے انگریز ترجمہ کرنے والوں میں سے سب سے مشہور، اور سب سے زیادہ عالم جارج سیل مانے جاتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ:

"قران کا طرز عام طور پر سندر اور دریا کی طرح بہتا ہے، ایک ایک ایت کے اندر، بہت سی باتیں پہاڑ جیسے شبدوں میں کہی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں مطلب بھی اتنا صاف سمجھ نہیں آتا ہے۔ بیچ بیچ میں زبان کی خوبصورتی کو بڑھانے والی ایشیائی ڈھنگ کی اونچے درجے کی تشبیہیں یعنی اپمائیں ہیں، چبھتے اور چمکتے ہوئے جملوں نے زبان میں اور بھی جان ڈال دی ہے اور بہت سی جگہوں پر جہاں خاص طور پر اللہ کی تعریف اور اس کے گن بیان کئے گئے ہیں۔ زبان بہت ہی اونچی بڑھیا اور شاندار ہے۔"[40]

آپ نے سندر لال جی کے پیش کردہ کلام بلخصوص جارج سیل کا حوالہ دیکھیں تو اندازہ ہو گا کہ جس تعریف کرنے کے ضمن میں انھونے نیک نیتی و شفاف دل سے قران و گیتا میں مشابہتیں ڈھونڈھنے کے ضمن میں بر سبیل تذکرہ جارج سیل کا حوالہ پیش کیا وہ جارج سیل اور اس کا ترجمہ اپنے وقت کا نسبتاً اچھا ترجمہ ہونے کے باوجود، مسلم مترجمین، مفسرین، علما کے نزدیک ناقص و غلطیوں سے پر ترجمہ ہے۔ عربی کی خوبصورتی و عظمت اچھے اچھے قاموسیوں کو اختلاف کے باوجود تسلیم کرنی پڑی تھی، اور جہاں عربی کی عظمت کا احوال بیان کیا جائے تو سوچیں وہ کیسے قران کا ذکر کئے بغیر نکل جائیں:

چناچہ انتھونی اپیاہ اور لوئی گیٹس جونیر کہتے ہیں کہ:

"عرب اپنی زبان کو اپنا سب سے قیمتی متاع تصور کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ یہ زبان ہزاروں سال پرانی، ادبی، مذہبی اور علمی روایت کی امین ہے۔ عربی زبان میں شروع ہی سے نئے نئے معانی شامل ہوتے چلے گئے ہیں اور نئے تصورات کے اظہار کے لئے نئی اصطلاحات منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اس کی تمام قدیم لفظیات اور قواعد آج بھی زندہ ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے بعض الفاظ محاورے اور اصطلاحیں، آج زیادہ استعمال میں نا آتی ہوں لیکن انہیں متروک خیال نہیں کیا جاتا

ہے۔اس پر طرہ یہ کہ قران کو اسلامی دنیا میں ایک نادر حیثیت حاصل ہے۔نہ صرف ایک مذہبی کتاب ہونے کے ناطے بلکہ ایک ادبی شاہکار کی حیثیت سے بھی اور اس کے اسلوب کو زبان دانی کے آیڈیل کے طور پر لیا جاتا ہے۔"[41]

چناچہ اس کل بحث کے تناظر میں یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہو گیا ہے کہ عربی اگر عبرانی سے تحریری طور پر قدیم الاصل نہیں ہے تو جدید بھی نہیں ہے، اور اس کا زبانی، کلامی ثبوت اتنا قدیم ہے جتنے عاد و ثمود تھے، لہذا اس تناظر میں مستشرقین کے عربی و قران کے اوپر اعتراضات فاسد قرار پاتے ہیں۔

حوالہ جات:

[1] The Cambridge Encyclopedia .Key:Ur. Cambridge University.press.1990,pp:12250.
[2] Alice C. Linsley. What Language Did Abraham Speak?biblical Anthropology.24.6.2011.Boblical Anthropology.
. https://biblicalanthropology.blogspot.com/2011/06/what-language-did-abraham-speak.html
[3] Ibid,key word:Ishmael.pp.622.
[4] Jonathan black.The Secret History Of the World.Quercus.london.2019.pp:.215

[5] قران: سورہ ابراہیم:37۔

[6] ابن کثیر، امام عماد الدین۔ قصص الانبیا۔ الفقہ الحدیث پبلیکیشنز۔ لاہور۔2007۔ صہ:170،169۔

[7] ول ڈیورانٹ۔ ہیروز آف ہسٹری۔(مترجم اردو: یاسر جواد)۔ مشتاق بک کارنر۔ لاہور۔2015۔ صہ:66۔

[8] القران: الاعراف:74۔۔القمر:23۔

[9] القران: حود:94۔

[10] ول ڈیوانٹ۔ محولہ بالا صہ:70۔

[11] ایضاً: صہ:71۔

[12] سنگھیڑ، اعبد لعزیز۔ ایک خدا ایک پیغام۔ نگارشات۔ لاہور:2023، صہ:223۔

Cambridge Encyclopedia.opcite.pp.876.

[13] احمد خالد۔ لفظون کی کہانی لفظون کی زبانی۔ مشعل بکس۔ لاہور۔2010۔ صہ:114۔

[14] Sarah Pruitt. What Language Did Jesus Speak?.History.com. https://www.history.com/articles/jesus-spoke-language
[15] Roger T. Macfarlane.Hebrew,Aramic,Greek and Latin.Languages Of New Testament Judea.byu Studies.
https://byustudies.byu.edu/article/hebrew-aramaic-greek-and-latin-languages-of-new-testament-judea
[16] https://www.bbc.com/urdu/world/2014/05/140527_jesus_language_rk
[17] Hutchinson twenty Century Encyclopedia.,Hutchinson&co.london.reprinted .1961.pp:511.
[18] Ibid.pp:510.

[19] روس جان۔یروشلم۔نگارشات۔لاہور۔2021۔صہ:37۔

[20] ایضاً:صہ:28:بحوالہ۔ستاین اور سلبرمان:2002-45-2002)۔

[21] ایضاً:صہ:40۔بحوالہ:ہرزاگ۔29۔اکتوبر۔1999۔6-8۔

[22] ایضاً:صہ:41۔

[23] ایضاً:صہ:43۔

[24] Robert Dorit. Rereading Darwin.American Scientist .
https://www.americanscientist.org/article/rereading-darwin

[25] حراری،یوال نوح۔(نیکسس)آرٹیفشل انٹیلیجنس اور نیاعالمی نظام:فکشن ہاوس۔لاہور۔2014۔صہ:119،118۔

[26] Noah Tesch.(ed) Aramaic language.Encyclopedia brittanica.(online)..
https://www.britannica.com/topic/Aramaic-language

[27] جامعی سید خالد اور عمر حمید ہاشمی بروشسکی زبان:بعض اہم مباحث:جریدہ:30:شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی۔صہ:34،33۔

[28] Mishnah-
[29] Rabbi Yehudah HaNasi-

[30] ایضاً۔

[31] Hatzvi

[32] جامعی سید خالد اور عمر حمید ہاشمی۔محولہ بالا۔صہ:36۔

[33] David Yellin(1941–1864)
[34] David Yellin College of Education
[35] https://www.jewishvirtuallibrary.org/david-yellin

[36] جامعی سید خالد،اور عمر حمید ہاشمی،محولہ بالا۔صہ:36۔

[37] لیبان ڈاکٹر گستاولی۔تمدن عرب۔الفیصل ناشران و تاجران کتب۔لاہور۔2020۔صہ:37،36۔

[38] Jonathan black.opcite.

[39] ایضاً:صہ:40۔

[40] سندر لال۔قران اور گیتا۔فکشن ہاوس۔لاہور۔2014۔صہ "124۔

[41] کوامے انتھونی پیاہ اور ہنرل لویس گیٹس جونیر۔عالمی ثقافت کی لغت۔مشعل بکس۔لاہور۔صہ 207،206۔

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License.